تذکرہ

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

www.abulhasanalinadwi.org

بار اول

۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۴ء

نام کتاب	:	تذکرہ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلیؒ
مصنف	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
کمپوزنگ	:	عطاء الرحمٰن (تعمیر حیات)
تعداد	:	۱۱۰۰
صفحات	:	۱۲۰
طباعت	:	پاریکھ آفسٹ پرنٹنگ پریس ٹیگور مارگ، لکھنؤ
قیمت	:	۵۰؍روپئے

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

www.abulhasanalinadwi.org

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
❁	عرض ناشر	
❁	مقدمہ	۵
❁	باب اول	
❁	**خاندان، جدامجد اور والد ماجد**	
(۱)	خاندان	۲۴
(۲)	جدامجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی	۲۶
(۳)	والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ	۲۸
❁	باب دوم	
❁	**ولادت سے وفات تک**	
(۴)	ولادت وطفولیت	۳۴
(۵)	دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم	۳۹
(۶)	دارالعلوم دیوبند	۴۰
(۷)	حاذق الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں	۴۵
(۸)	انگریزی تعلیم کی ابتداء	۴۶
(۹)	بی، ایس، سی میں امتیاز کے ساتھ کامیابی	۴۸
(۱۰)	والد ماجد کے نام ایک تاریخی خط	۴۸

www.abulhasanalinadwi.org

(۱۱) میڈیکل کالج میں داخلہ ۵۴
(۱۲) والد ماجد کی وفات ۵۶
(۱۳) نواب نورالحسن خان مرحوم کے خاندان کی ہمدردی وعنایت ۵۷
(۱۴) میڈیکل کالج سے فراغت اور مطب کا آغاز ۸۵
(۱۵) بیعت وحج ۵۹
(۱۶) ندوہ کی خدمت ۶۳
(۱۷) دوسرے اداروں اور شخصیتوں سے تعلق ۶۵
(۱۸) عام الحزن ۷۳
(۱۹) علالت اور وفات ۷۴

❁ باب سوم

❁ امتیازات وخصوصیات

(۲۰) حلیہ اور چند خصوصیات وامتیازات ۷۶

❁ باب چہارم

❁ تذکرۂ فرزند

(۲۱) محمد الحسنیؒ (محمد میاں) ۸۹

❁ باب پنجم

(۲۲) میری تعلیم اور مطالعہ ۱۱۹

❁❁❁

www.abulhasanalinadwi.org

عرض ناشر

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندویؒ کی شخصیت بڑی متوازن اور جامع تھی، عقیدہ وعمل میں رسوخ وتصلب کے ساتھ وہ بڑے وسیع الفکر اور بالغ نظر تھے، عالم اسلام سے ان کو گہری واقفیت تھی، تربیت کا ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان ہی سے تربیت پائی، مولانا کے علاوہ اپنے فرزند مولانا سید محمد الحسنی اور خواہرزادگان مولانا سید محمد ثانی حسنی، مولانا محمد رابع حسنی اور مولانا واضح رشید ندوی کی بھی انہوں نے خاص نگہداشت رکھی اور تربیت کی، اپنی صاحبزادیوں کی تعلیم وتربیت کا بھی انہوں نے بڑا اہتمام کیا، قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث کی بعض ابتدائی کتابوں کی ان کو تعلیم دی، اشاعت اسلام کی ان کو بڑی فکر تھی اور اس کے لئے انہوں نے بڑی کوششیں فرمائیں اور اس کے اچھے نتائج نکلے، وہ مسلسل تیس سال ندوۃ العلماء کے ناظم رہے، ان کے دور میں دارالعلوم کی ترقی ہوئی، اور بعض عرب اساتذہ کے آنے سے عربی زبان وادب کا ماحول پیدا ہوا۔

وہ اسلامی مزاج کی پوری تصویر تھے، ان کی زندگی دین کی ترجمان تھی، سنتوں کا بڑا اہتمام فرماتے اور حقوق کی ادائیگی میں ان کی زندگی مثالی اور قابل تقلید

www.abulhasanalinadwi.org

تھی، عرصہ سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان پر مشتمل کوئی کتاب سامنے آنی چاہئے تاکہ اس سے تعلیم یافتہ طبقہ خاص طور پر روشنی حاصل کر سکے، اب یہ ضرورت حضرت مولانا کے اس طویل مضمون کو کتابی شکل دے کر پوری کی جارہی ہے، جوانہوں نے حیات عبدالحی کے اخیر میں بطور ضمیمہ کے قلمبند فرمایا تھا، وہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا بہترین سوانحی خاکہ ہے، حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہم کے مفصل مقدمہ نے کتاب کی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کی بعض وہ اہم خصوصیات اور طریقہ تربیت کا ذکر آ گیا ہے جو پوری طرح اصل کتاب میں نہیں آسکا تھا، شروع میں خاندان کے مختصر تعارف کے ساتھ جد امجد اور والد ماجد کا مختصر تذکرہ شامل کر دیا گیا ہے، اور اختتام صاحب سوانح کے فرزند مولانا سید محمد الحسنیؒ کے تذکرہ پر کیا گیا ہے، جو حضرت مولانا ہی کا تحریر فرمودہ ہے، اور تعمیر حیات کے محمد الحسنیؒ نمبر سے لے کر اس کو شامل کتاب کیا ہے، کتاب پریس میں جانے ہی کو تھی کہ ماہنامہ رضوان کی فائلوں میں ڈاکٹر صاحب کی ایک صاحبزادی ''اہلیہ مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ'' کا ایک مختصر اور مؤثر مضمون نظر آیا جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے زیر سایہ اپنی تعلیم و تربیت سے متعلق لکھا ہے اس کو بھی کتاب میں شامل کیا جارہا ہے، اس طرح یہ مکمل کتاب قارئین کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کو عام فرمائے، اور اس کی طباعت و اشاعت میں حصہ لینے والوں کو اجر عطا فرمائے، (آمین)

۳ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دارعرفات

www.abulhasanalinadwi.org

مُقدّمہ

از ——————— مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت عصر حاضر کی ایک ایسی جامع شخصیت تھی جس نے دین و دنیا کو بہت متوازن طریقہ سے جمع کیا تھا، دونوں کے علوم میں دستگاہ پیدا کی تھی، دینی علوم انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں، پھر دارالعلوم دیوبند میں حاصل کئے، اور ان کی تکمیل کے ساتھ طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کی، پھر عصری تعلیم کی طرف توجہ کی، اور سائنس میں بی۔ ایس۔ سی تک، پھر میڈیکل تعلیم ایم۔ بی۔ بی۔ ایس تک حاصل کی، اور اس دنیاوی تعلیم میں بھی وہ پوری مدت اپنی اسی وضع قطع اور کردار پر قائم رہے جو دینی تعلیم حاصل کرنے والے کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے، اسی کے ساتھ وہ تحصیل علم کے دوران طالب علمانہ انضباط و نظم وضبط کا پورا خیال رکھتے تھے، ان کا طریقہ سال کے تمام دنوں میں یکساں محنت کرنے کا رہتا تھا، چنانچہ امتحان کے زمانہ میں ان کو تیاری کرنے کے لئے عام دنوں کے وقت سے زیادہ صرف نہیں کرنا پڑتا تھا، اور وہ اس کے قائل بھی نہ تھے کہ دورانِ

www.abulhasanalinadwi.org

سال تعلیمی محنت کم کی جائے، پھر اس کی تلافی امتحان کے زمانہ میں کی جائے، ان کا طریقہ تعلیمی مشغولیت کو رات میں زیادہ حصہ دینے کا بھی نہیں تھا، وہ دن کو ضرورت کے مطابق علم کی مشغولیت میں گذارتے، اور رات میں جسم کو اس کی ضرورت کے مطابق راحت دینے کے قائل تھے، رات کو زیادہ بیداری میں گزارنا صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس کی وہ دوسروں کو بھی تاکید کرتے تھے، چنانچہ ان کا حصول علم ایک متوازن تسلسل کا حامل رہا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ امتحان کے موقع پر ان کے علم میں پختگی ظاہر ہوتی تھی، اور وہ امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کرتے تھے، ان کو بی۔ایس۔سی کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے پر تمغۂ امتیاز بھی ملا تھا، اور جب انہوں نے ایم۔بی۔بی۔ایس کر کے علاج و معالجہ شروع کیا تو طبی کام میں ان کی مہارت ظاہر ہوئی، اور ان کی تشخیص و علاج کا لوگوں کو بہت اچھا تجربہ ہوا۔

تحصیل علم میں علوم کا تنوع اور جامعیت ان میں بڑے اچھے انداز میں آئی کہ اولاً علوم دینیہ کی تکمیل اور اس کے ساتھ طب یونانی کی تعلیم، پھر علوم عصریہ کی تعلیم اور سائنس میں بی ایس سی، پھر میڈیکل تعلیم اور اس کی تکمیل، اس طرح انہوں نے علوم کے مختلف انواع جمع کر لئے، پھر عملی طور پر ان سب علوم سے فائدہ اٹھایا، اور فائدہ پہونچایا، یہ ایک بہت کم واقع ہونے والی بات ہے، اور اس میں یہ اضافہ کہ ایلو پیتھک علاج میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ہومیو پیتھک کا بھی مطالعہ کر کے اس کے علاج کو بھی اپنایا، چنانچہ وہ مریضوں کے لئے دوا تجویز کرنے میں تینوں طریقۂ علاج پر نظر رکھتے تھے، اور ایلو پیتھک علاج کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً دیگر طریقۂ علاج کی ضرورت محسوس کرنے پر اس کی دوا بھی تجویز کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالعلی حسنی صاحب نے جو تنوع طالب علمی میں حاصل کیا اس کی وجہ

www.abulhasanalinadwi.org

سے ان کی تعلیم کی تکمیل ذرا دیر میں ہوئی، تکمیل تعلیم سے ذرا قبل ان کے والد کا انتقال ہوگیا، یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے، جب کہ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت ۳۰-۳۱ سال کی ہوچکی تھی، اور ابھی وہ ایم بی بی ایس سے فراغت کے مرحلہ کو نہیں پہونچے تھے، اس لئے ان کے سامنے زندگی کے اقتصادی تقاضے کا مسئلہ آ گیا، ایک طرف چھوٹا بھائی جس کی عمر صرف نو سال کی، دوسری طرف والد صاحب کا اقتصادی ذریعہ منقطع ہوجانا، اور کوئی دیگر قابل ذکر ذریعہ نہ تھا، ایسی صورت میں ڈاکٹر صاحب نے شریفانہ وضع داری پوری قائم رکھتے ہوئے حکمت سے کام لیا، اور تعلیم سے جلد فراغت کر کے اقتصادی ذریعہ اختیار کرنے کی طرف توجہ دی، اور اس کو انہوں نے خوبی کے ساتھ کیا، یہ سب ایسے متوازن اور باوقار انداز میں تھا کہ جلد ہی وہ نیک نامی جو اُن کے والد کو حاصل تھی، ان کو حاصل ہوگئی۔

اللہ کی طرف سے ان کو دست شفاء بھی حاصل ہوا کہ عام طور پر ان کی تشخیص برحق اور علاج کو کارگر سمجھا جانے لگا اور مشکل امراض میں بھی ان کی تجویز کو بہتر پایا جاتا تھا، بتدریج ان کو نہ صرف علاج والے حلقوں میں بلکہ اہل شہر میں، اور خود ان کے خاندان میں بڑی عزت وقدر سے دیکھا جانے لگا، ندوۃ العلماء کی وہ سربراہی جو بطور ناظم ان کے والد کو حاصل ہوئی تھی، وہ بھی ان کے سپرد ہوئی۔

کردار وصفات کے لحاظ سے ان میں شائستگی، حسن اخلاق، کم گوئی، توجہ و ہمدردی کی صفات تھیں، اور ظاہر و باطن دونوں ایک متین عالم دین کا تھا، مغربی تہذیب و تمدن کی کمزوریوں اور فائدوں سے واقفیت رکھتے تھے، لیکن اس میں احتیاط اور کھلے ذہن کا رویہ رکھتے تھے، اس کی علمی ترقی وافادیت سے فائدہ اٹھاتے، لیکن اس کی تہذیبی کمزوریوں سے اپنے دامن کو صاف اور بے داغ رکھتے تھے، اس کے سامنے کسی طرح

www.abulhasanalinadwi.org

کی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے تھے، وہ زندگی کے ہر مسئلہ میں شریعت کے حکم کو دیکھتے تھے، مسلمانوں کے معاملات سے، دنیا میں جہاں بھی ہوں، دلچسپی رکھتے تھے، اور ان کے حالات سے واقف ہونے کی کوشش کرتے، اور ان کی خیر خواہی کی کوئی شکل قابل عمل ہوتی تو کرتے، چنانچہ حرمین شریفین میں قائم دینی مدرسوں کو مالی مدد بھجوانا، فلسطین اور الجزائر میں دشمنان اسلام سے گلوخلاصی کی جو کوششیں ہو رہی تھیں، ان سے ہمدردی کا اظہار، اور ہندوستان میں اصلاح و دعوت کا جو کام انجام پا رہا تھا، اس کی حمایت کرنا اور اظہار قدردانی کرنا، یہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اہم خصوصیات میں تھا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، انہوں نے نصاب تعلیم میں بعض ایسی اصلاحات کرائیں جو وسعت علمی اور حسن کردار کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تھیں، اور ندوۃ العلماء کے مقاصد کے مطابق تھیں۔

عربی زبان کی مروجہ تعلیم کے سلسلہ میں ان کا ایک خیال یہ تھا کہ اس کی تعلیم میں الفاظ و عبارت اور اس کے قواعد کے درمیان مناسبت اور ترتیب موزوں نہیں رکھی جاتی ہے، اور اس میں طالب علم کی نفسیات اور فطری صلاحیت، استفادہ و حصول کی رعایت نہیں کی جاتی، اور اس کے اولین مرحلہ میں ہی قواعد کا بھاری بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جس کی بناء پر عربی کا طالب علم پریشانی اور اکتاہٹ میں پڑ جاتا ہے، اور متعدد طلبہ ہمت ہار کر شروع کے مرحلہ میں ہی عربی تعلیم سے منہ موڑ لیتے ہیں، ان کے نزدیک زبان کی عبارت کو مقدم ہونا چاہئے اور قواعد کو ذرا تاخیر سے اور قابل برداشت حد تک رکھنا چاہئے، انہوں نے اپنے اس اصول کو ندوہ ہی پر لازم نہیں کیا، بلکہ خود اپنے صاحبزادے پر اس کو عمل میں لائے اور اس کے فائدہ کی مثال سب نے یہ دیکھی کی عربی دانی اور عربی مضمون نگاری و ترجمہ میں ان کے صاحبزادے مولانا محمد الحسنی کم

www.abulhasanalinadwi.org

عمری ہی سے اتنے فائق ہوئے کہ ان کے زمانے میں برصغیر میں، ان جیسے عربی میں اہل قلم بہت گنے چنے ہوئے، ندوۃ العلماء کی حد تک انہوں نے نحو وصرف کی تعلیم میں تسہیل وتدریج کو لازم کیا، تاکہ طلبہ اکتائے بغیر عربی کی تعلیم حاصل کرسکیں، ان کی دونوں باتوں پر عمل کے نتیجے بہت اچھے ظاہر ہوئے۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلیمی وتربیتی نقطۂ صرف نظریاتی نہ تھا، بلکہ عملی طور پر اس کو انہوں نے جاری کیا، اس پر عمل خود اپنے گھر سے کیا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اپنے اکلوتے صاحبزادے پر اس کا اجراء کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک نقطۂ نظر یہ تھا کہ تعلیم کے معاملہ میں اصل مقصد استعداد کا پیدا کرنا اور حصول علم ہے، وہ کہتے تھے کہ مرحلۂ تعلیم کے اختتام پر حصول سند کی اہمیت جتنی ہوگئی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اصل زور استعداد بنانے پر دینا چاہئے، ان کا یہ خیال اس حد تک قوی تھا کہ خود اپنے بیٹے کے لئے انہوں نے درجات میں نام لکھا کر پڑھنے کو اہمیت نہیں دی، بلکہ مختلف اساتذہ سے پڑھوانے اور صرف پڑھنے کو کافی سمجھا، چنانچہ ان کے صاحبزادے کو کوئی سند حاصل نہیں ہوئی لیکن علمی استعداد پختہ تھی، اور علمی وادبی کارکردگی میں اتنی فوقیت حاصل ہوئی کہ ہندوستان سے لے کر ممالک عربیہ کے حلقوں تک میں ان کی تحریری وفکری صلاحیت کی قدر کی جاتی تھی، اور وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وادبی مقام میں جانشیں کی حیثیت حاصل کرلینے کے راستہ پر آگئے تھے۔

خود مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی جو ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، لیکن عمر میں تقریباً ۲۲ سال کا فرق تھا، والد کے انتقال پر مولانا علی میاںؒ صرف نو سال کے تھے، اور تعلیم وتربیت کے آغاز میں تھے، والد کے انتقال پر یہ بڑے

www.abulhasanalinadwi.org

بھائی ان کے لئے والد کے قائم مقام ہوگئے تھے، یہ قائم مقامی ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھی کی، اور مولانا علی میاںؒ کو ایک کامیاب طالب دین اور ممتاز صلاحیت کا حامل فرد بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی، اور اس کا مولانا علی میاں صاحبؒ کی عظیم شخصیت بننے میں ایک قابل قدر حصہ ہے جس کا اعتراف خود علی میاں صاحبؒ کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا دورِ نظامت، ندوہ کے لئے ملک کے مشکل حالات میں تھا، آزادیٔ ملک کی جدوجہد، پھر ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات اور تبادلۂ آبادی، جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں میں اہل علم وصلاحیت افراد کی ایک بڑی تعداد کا ترک وطن، نیز وسائل ومال کی کمی، یہ وہ معاملات تھے جن سے علمی اداروں کے بقاء کے لئے خطرات پیدا ہوگئے تھے، لیکن الحمدللہ باعزیمت افراد نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ حکمت وبرداشت کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں پر قائم رہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آئی، اور یہ ادارے قائم رہے، بلکہ بتدریج ان کے لئے نئی راہیں کھلیں، اس سلسلہ میں اداروں کے ذمہ داروں کی کوششیں قابل داد ہیں، مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دورِ نظامت کی ان مشکلات میں اپنے رفقاء کے ساتھ کوشاں رہے، اور بے ہمت نہیں ہوئے، ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری کو اس کے وقار کے ساتھ پورا کیا۔

مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ عصر جدید کی ترقیات اور علمی تحقیقات سے واقف تھے، اور دینی علوم کی باقاعدہ تحصیل کی بناء پر اسلامی تقاضوں اور دینی تربیت ودعوت کی ذمہ داری بھی سمجھتے تھے، اس لئے ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ دینی و دنیاوی دونوں کی تعلیم ونصاب تعلیم کے مفید عناصر کو یکجا کرنا امت کی نئی نسلوں کی تربیت کے لئے ضروری ہے، ڈاکٹر صاحب اور ان سے متفق الرائے ان کے رفقاء

www.abulhasanalinadwi.org

کے اس خیال کا اثر خود ندوہ العلماء کے نصاب تعلیم کی تشکیل میں ملتا ہے، چنانچہ انہوں نے جن افراد کی تعلیم کی پوری ذمہ داری ان پر تھی ان کے نظام تعلیم میں جدید وقدیم دونوں طریقوں کو اپنایا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ بھی تھا کہ مضامینِ تعلیم بیک وقت بکثرت نہ ہونے چاہئیں، ان کی کثرت سے طالب علم کی تعلیمی یکسوئی متاثر ہوتی ہے، ممکنہ حد تک یکے بعد دیگرے ہونا چاہئے، چنانچہ انہوں نے اسی کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کے تعلیمی سلسلہ میں معاملہ کیا، پھر اپنے صاحبزادے مولانا محمد الحسنیؒ کے معاملہ میں بھی یہی کیا، اور یہ مفید ثابت ہوا، دونوں کی عملی صلاحیتوں میں اس طریقۂ تعلیم کی افادیت دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ اپنی ڈاکٹری پریکٹس کی مشغولیت کی وجہ سے دوسری مشغولیتوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوسکتے تھے، لیکن پھر بھی ان کا مطالعہ دونوں اقسامِ علم یعنی علوم اسلامیہ اور علوم دنیویہ میں برابر جاری رہتا تھا، اور وہ اس کے ذریعہ جدید حالات میں امت مسلمہ کے صلاح وفلاح کی تدابیر کو سمجھنے میں مدد لیتے تھے، اور اپنے تعلق والوں کو اس کے مطابق مشورے بھی دیتے تھے، اس کی مثال یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاح وارشاد کے کام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے عہد کی دعوت وتبلیغ کی کوشش، جو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جاری کی تھی، وہ ان کی نظر میں بہت برمحل اور مفید تھی، وہ اس کی حمایت کرتے تھے، لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، اور اسی کے ساتھ علمی میدان میں ایسا لٹریچر تیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے جس کے ذریعہ مسلمانوں اور خاص طور پر نئی نسل کو اسلامی فکر وکردار کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے، اسی کے ساتھ وہ عہد حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان علمی موضوعات کو شامل نصاب کرنے پر زور دیتے تھے جن سے موجودہ

www.abulhasanalinadwi.org

حالات میں مسلمانوں کو واسطہ پڑسکتا ہے، مثلاً تاریخ، جغرافیہ اور تمدنی واجتماعی مضامین، اسی کے ساتھ وہ مروجہ زبانوں کو بھی اہمیت دیتے تھے، انہوں نے خود بھی حسب موقع اس میں حصہ لیا، چنانچہ عالم اسلام کے جغرافیہ پر خود ایک کتاب تیار کی، پھر اپنے بھانجہ (راقم تحریر ہذا) کو جنہوں نے ان ہی کی تربیت ونگرانی میں تعلیم حاصل کی، عالم اسلام کے جغرافیہ پر ایک ایسی کتاب تیار کرنے کی تلقین کی جس میں صرف مقامات کا جغرافی تعارف نہ ہو، بلکہ اس میں سیرت نبوی اور ثقافت اسلامی کے سمجھنے میں جن جانتوں سے مدد مل سکتی ہو، ان کو نمایاں کیا جائے، چنانچہ اس پر کتاب جغرافیہ ممالک عربیہ کا حصہ اول (جزیرۃ العرب) ان کی زندگی ہی میں تیار کیا گیا، جس کو انہوں نے دیکھا اور مشورے دیئے، جو اس میں شامل کئے گئے۔

مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کو امت مسلمہ کے ان عناصر کے سلسلہ میں بھی، جو دنیا کے دور دراز حصوں پر بسے ہوئے ہیں، حالات جاننے اور یہ کہ ان سے کیا ہمدردی کی جاسکتی ہے، اور ان کی رہنمائی اور اخلاقی مدد کیا کی جاسکتی ہے، اس کا برابر خیال رہتا تھا، انہوں نے بین الاقوامی ڈائرکٹری (اسٹیٹس مین ایر بک) منگوا کر اس میں مختلف ملکوں کے حالات دیکھے، اور ان سے فائدہ اٹھایا، اور اس کے بعض مقامات پر نوٹ بھی چڑھایا، اس کی مثال یہ ہے کہ نیپال کے تذکرے کے صفحات کے حاشیہ پر وہاں کے مسلمانوں کے متعلق اپنی وہ معلومات بھی درج کردیں، جو ان کو نیپال کے ایک عالم کے ذریعہ، جنہوں نے ندوہ میں تعلیم حاصل کی تھی، معلوم ہوئی تھیں، وہ آزادئ فلسطین کی کوششوں سے دلچسپی لیتے تھے، اور وسط ایشیا کے ممالک میں بسے ہوئے مسلمانوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، مرکز اسلام حجاز کے معاملات سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، شاہ ابن سعود نے جب اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

انقلابی کوشش سے حجاز پر اقتدار حاصل کیا تھا اس کے معا بعد ڈاکٹر صاحب کو حج کا موقعہ ملا تھا، وہ وہاں شاہ ابن سعود سے بھی ملے، اور ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کو کچھ مفید مشورے بھی دیئے، اور جب ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا حج کیا تو ڈاکٹر صاحب نے وہاں کے دینی اور اجتماعی مصالح کی تقویت کے تعلق سے ان کو ہدایات اور مشورے دیئے، پھر ۱۹۵۰ء میں جب مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ حجاز کا سفر کیا اور اس میں مصر و سوڈان و شام کے سفر کا بھی قصد کیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کی اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے خصوصی رہنمائی کی اور مدد بھی کی اور عالم عربی کے اس دورہ کو بہت ضروری اور مفید قرار دیا، اور اس کی تفصیلات، دورہ کے دوران، خط و کتابت کے ذریعہ اور دورہ کے بعد زبانی معلوم کرتے رہتے تھے، مولاناؒ کو اس سے بڑی مدد ملی، اور ان کا دورہ بہت مفید رہا۔

مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت اور اس کی مفید اور صحیح ذہن سازی کی طرف خصوصی توجہ تھی، اس کے لئے وہ عملی طور پر بھی جو کر سکتے تھے وہ کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے ان طبقات کے لئے جو اپنے حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع مہیا ہونے کی فکر کرتے، اور اپنے خاندان کے بچوں کے معاملہ میں تو بہت ہی فراخ دل تھے، خاندان کے جن بچوں کو لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنا ہوا، ان سب نے ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ان کے خود اپنے بچوں کی طرح تعلیم حاصل کی، اور اعزہ کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ بے تکلف آ کر قیام کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس فراخ دلی کا معاملہ خاندان سے باہر ان لوگوں کے لئے بھی تھا جو اہل دین میں شمار ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی اسی خوش

www.abulhasanalinadwi.org

اخلاقی کا معاملہ رہتا تھا، چنانچہ علماء وصلحاء کی آمد بھی ہوتی اور ان کی میزبانی بھی ہوتی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تو ڈاکٹر صاحب کا ارادت کا تعلق بھی تھا، چنانچہ وہ لکھنؤ جب بھی تشریف لاتے تھے ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہی قیام ہوتا، ڈاکٹر صاحب اس کو اپنے لئے عزت کی بات سمجھتے، دیگر صلحاء وعلماء کے ساتھ بھی اسی سے ملتا جلتا معاملہ رکھتے، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے جو لکھنؤ ہی میں تھے ڈاکٹر صاحب کا بہت تعلق تھا، اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازین میں تھے، ڈاکٹر صاحب بہت دوستانہ اور مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی لکھنؤ آمد پر ڈاکٹر صاحب سے ملنے تشریف لائے، اور ڈاکٹر صاحب ان کی مجلس میں برابر جاتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو آخر میں اپنا معمول بنالیا تھا کہ ہر جمعہ کو آتے اور نماز پڑھتے، پھر دوپہر کا وقت ایک ہی کمرہ میں ساتھ گذارتے، اس طرح سے ان کے ساتھ جلدی جلدی ملنا جلنا ہوتا، علاج کی ضرورت پڑتی تو ان ہی سے علاج کراتے، کوئی دیگر معاملہ ہوتو آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ لیتے۔ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد مولانا عبدالباری صاحب نے ڈاکٹر صاحبؒ کے متعلق بہت تعلق خاطر کا مضمون لکھا جس کا نام تھا ''ایک فرشتہ صفت انسان۔''

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بڑی صفت تھی بخل اور اسراف دونوں سے پورا گریز۔ وہ اپنے تمام کاموں بلکہ اپنی تمام ضروریات میں اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی خرچ اسراف کے دائرہ میں نہ آئے، زندگی کو مناسب معیار سے قائم رکھنے میں بھی ہر طرح کے غلو سے اجتناب کرتے اور اپنی اور اپنے بچوں اور گھر والوں کی ضرورتوں پر صرف اتنا ہی خرچ کرتے جتنا کفایت کے اندر ہوتا، لیکن مہمانوں اور اہل

www.abulhasanalinadwi.org

ضرورت کے لئے ہمدردی رکھتے اور مدد کرتے، البتہ اپنی ضروریات کے معیار کو ایسا بلند نہیں بنایا تھا کہ وہ اپنی نظر ہی میں نہیں بلکہ دوسروں کی نظر میں بھی ذرا بھی اسراف محسوس کیا جاتا، لیکن حقوق کی ادائیگی اور دینی تقاضا پر خرچ کرنے میں فیاضی کا معاملہ تھا، دینی مقاصد کا کوئی چندہ ہو، اور اعزہ کے ساتھ صلہ رحمی کا موقع ہو، اور اہل وعیال کی واقعی ضرورتیں ہوں ان میں بلا دکھاوا اور ریاء کے صرف کرتے، مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے مدرسوں کو چندہ بھیجتے، الجزائر کی آزادی کی کوششیں ہوں، یا فلسطین میں یہود سے گلوخلاصی کی کوششیں ہوں، جب بھی ضرورت دیکھی چندہ سے تعاون کیا، خود اپنی اولاد کو بھی رغبت دلائی کہ وہ بھی حسب گنجائش چندہ میں حصہ لیں۔

صلہ رحمی کا یہ حال تھا کہ جس کا رشتہ جتنا قریب ہوتا اس کی اتنی ہی زیادہ فکر کرتے، اور عمومی طور پر ہر رشتہ دار کے ساتھ کم از کم مہمان داری کا رویہ رکھتے، چنانچہ ان کا گھر تمام اہل خاندان کے لئے لکھنؤ میں ہمہ وقت ایک مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اعزہ اپنے کام سے لکھنؤ آتے تو اپنی مرضی کے مطابق مدتِ قیام اختیار کرتے، اور مہمان بلکہ گھر کے افراد کی طرح رہتے، اور یہ بات خود ان کے والد مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے چلی آرہی تھی جس کو ڈاکٹر صاحب نے پوری فراخ دلی کے ساتھ قائم رکھا۔

صفائی معاملات اور احتیاط ان کے مزاج میں اعلیٰ سطح کی تھی، وہ ندوۃ العلماء کے سربراہ (ناظم) تھے، اور ان کا دفترِ نظامت شہر کے اندر ان کے مکان سے متصل مکان میں تھا، وہ دفتر جاتے یا دفتر کے کاغذات ان کے پاس آتے، جن پر وہ ہدایات اور منظوری لکھتے، اس کے لئے ایک دوات اور قلم ان کے پاس گھر میں بھی تھا، جس کو وہ نظامت کے کام کے لئے استعمال کرتے تھے، لیکن احتیاط یہ تھی کہ کسی دوسرے کام

www.abulhasanalinadwi.org

میں اس کو استعمال نہ کرتے، اور کسی کو اس کی اجازت بھی نہ دیتے کہ وہ اپنے ذاتی کام میں اس کو لائے، میں نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ اسی طرح ندوۃ العلماء کے استعمالی سامان سے بھی ذاتی فائدہ اٹھانے سے بچتے تھے، ایک بار جب بیماری کی وجہ سے ان کو کچھ دنوں کے لئے کرسی کی ضرورت پڑی اور وہ دارالعلوم کے مہمان خانہ کی کرسیوں میں تھی، تو مستعار منگوایا، اگرچہ وہ ندوۃ العلماء کے مہمانوں اور اس کے ذمہ داروں کی سہولت کے لئے تھی اور ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سربراہ ادارہ تھے لیکن اس کو کرایہ کے سامان کی حیثیت دیتے ہوئے اس کا کرایہ ادا کیا، بلا معاوضہ اس کو استعمال میں نہیں رکھا۔

ایک بار دارالعلوم میں کسی چیز کا معائنہ کرنے آئے، اس سے واپسی کا وقت تقریباً وہی تھا جو تعلیم کے اختتام کا تھا، میں نے ان کو واپسی کے لئے رکشا پر تنہا بیٹھتے دیکھا، دارالعلوم کے مہتمم صاحب پاس میں کھڑے کچھ بتا رہے تھے، مجھے خیال آیا کہ جگہ خالی ہے، مجھے بھی وہیں جانا ہے، لہذا میں اس سے فائدہ اٹھالوں، ان کی شفقت معلوم تھی، میں اس مقصد کے لئے قریب گیا کہ وہ خود کہیں گے کہ ساتھ چل سکتے ہو، لیکن انہوں نے خود نہیں کہا، بلکہ مہتمم صاحب کو جو سامنے کھڑے ان کو رخصت کر رہے تھے استفساری نظروں سے دیکھا، مہتمم صاحب نے فوراً کہا کہ یہ بھی بیٹھ جائیں، وجہ یہ تھی کہ سواری کا کرایہ دارالعلوم کی طرف سے دیا جانا تھا، کیونکہ وہ دارالعلوم کے کام سے آئے تھے، لہذا کمال احتیاط میں اس خالی جگہ کو اپنے عزیز کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ خود نہیں کیا۔

اسی طرح تقریباً ایک سالہ تعلیمی مدت کے لئے دارالعلوم دیوبند میں میرے پڑھنے کو طے کیا تو ہدایت کی کہ وہاں سے وظیفہ لینے کی ضرورت نہیں، میں ماہانہ

www.abulhasanalinadwi.org

بھیجتا رہوں گا، چنانچہ ماہانہ صرفہ برابر وہ بھیجتے رہے، اور میرے کھانے کا بار وہاں کے مطبخ پر نہیں ڈالنے دیا، حالانکہ وہاں عام طریقہ تھا کہ پڑھنے والوں کو وظیفۂ طعام ملتا تھا، یہاں لکھنؤ میں بھی میرے علاوہ ان کے سب قریبی عزیز لڑکے سب ان کے گھر پر رہ کر ہی ندوہ روزانہ جاتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے، اس طرح انہوں نے اپنے عزیزوں کا بار بھی ندوہ پر ڈالنے نہیں دیا۔

اسی طرح ایک بار میں نے ایک اردو اخبار کا زمزم کی طبی خوبیوں پر شائع مضمون لیجا کر ان کو دیکھنے کے لئے پیش کیا کہ اس کا طب سے اور دین سے تعلق ہے، لیکن انہوں نے اس کو بغیر دیکھے یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ زمزم کو ہم صرف اس کی دینی حیثیت کی بناء پر اہمیت دیتے ہیں، طبی مصلحت کی بناء پر نہیں دیتے، ان کی یہ ایک اہم صفت تھی کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں دینی اور شرعی ہدایتوں اور حیثیتوں کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے اور اسی کا سب کو مشورہ دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں خیر وخوبی کی یہ باتیں اور اسی طرح کی دوسری متعدد اچھی باتیں اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آئی تھیں، وہ اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں اپنے والد صاحب کے ایسے فرمانبردار فرزند رہے تھے کہ دوسروں میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے والد کے ایک محبّ اور دوست نے ڈاکٹر صاحب کے والد کی زندگی میں ہونے والے ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بہن (کاتب سطور کی والدہ) اپنی سسرال رائے بریلی سے اپنے والدین کے پاس آئی ہوئیں تھیں، ان کو رائے بریلی واپس جانا تھا، والد صاحب نے بلا کر کہا کہ اپنی بہن کو رائے بریلی پہونچا دیں، اس وقت کے مواصلات ایسے تھے کہ وہاں آنے جانے میں تقریباً دو روز صرف ہو سکتے تھے اور ڈاکٹر

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب کا امتحان کا پرچہ چھوٹ رہا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ فرمانبرادی تھی کہ امتحان کی بات نہیں کہی اور تعمیل حکم پر تیار ہو گئے، اس کا پتہ ڈاکٹر صاحب کے والد کے ان محبّ و دوست کو چلا، وہ فوراً آ گئے اور جا کر والد صاحب کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ عبدالعلی نے مجھے یہ نہیں بتایا، اور ان کے جانے کی بات واپس لے لی۔

ڈاکٹر صاحب میڈیکل کالج سے پڑھ کر آتے اور ان کے والد اگر کوئی ایسا کام بتا دیتے جس میں کہیں جانا ہوتا یا کچھ مشقت ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کیسے ہی تھکے ہوتے ذرا بھی تکلف ظاہر نہ ہوتا، فوراً اس کام کے لئے چلے جاتے، ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی نیکیاں اور سعادت مندیاں تھیں جن کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کو اپنی عملی زندگی میں معاشی خوش حالی بھی حاصل ہوئی، لوگوں کی نظروں میں نیک نامی اور شہرت و عزت بھی حاصل ہوئی، ان کی آل و اولاد کو بھی صلاح و فلاح کی نعمت ملی، اور ان نیکیوں کا صلہ انشاء اللہ آخرت میں اور بھی زیادہ ملے گا۔

حدیث شریف میں نیکی کی طرف دوسروں کو لانے کا ذریعہ بننے کا اجر بتایا گیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دیدے تو تمہارے لئے یہ سرخ اونٹوں کے حاصل ہونے سے بہتر ہے۔'' ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس پہلو سے بھی وافر حصہ ملا، انہوں نے تعلیم و صلاح و ہدایت سے دور لوگوں کو دین کی طرف لانے کے لئے جو کوششیں کیں ان سے کئی افراد نہ صرف یہ کہ کفر سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں آئے، بلکہ دینی تعلیم حاصل کر کے علماء کے زمرہ میں داخل ہوئے اور کتنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی فکر کی اور مدد دی جس سے وہ تعلیم یافتہ اور دیندار بنے، اور خود اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت کی جو فکر و سرپرستی کی جس کے ذریعہ ان کے صرف ایک عام تعلیم

www.abulhasanalinadwi.org

یافتہ شخص بننے کے بجائے مفکر اسلام اور ممتاز داعی و رہبر دین بننے میں خصوصی مدد ملی، پھر ان کے بھانجوں کو جن میں یہ خاکسار بھی ہے، دین وعلم دین سے تعلق قائم ہونے کی جو عزت ملی اس میں خصوصی حصہ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کیونکہ ہم بھائیوں کی پوری تعلیم ونگرانی ان کی اور ان کے چھوٹے بھائی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی تعلیم کا زمانہ بھی ان ہی کی سرپرستی میں گزرا تھا، کی نگرانی وسرپرستی میں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ کی طرف سے دوسروں کے ساتھ ہمدردی ان کے ڈاکٹری کے پیشہ کے ذریعہ بھی ہوتی تھی اور عام زندگی کے مواقع پر بھی ہوتی تھی، اور اس میں وہ شرعی ذمہ داری کو ہی بنیاد بناتے تھے، چنانچہ صلہ رحمی میں قریب ترین عزیز کو قریب ترین سے زیادہ حق دیتے تھے اور پڑوسی کو شریعت کے حکم کے مطابق اپنی ہمدردی کے زمرہ میں پوری طرح رکھتے، اپنے والد کے دوستوں کو حدیث شریف کے حکم کے مطابق اپنے اخلاق ولحاظ کا مخلصانہ حق دیتے تھے، اس سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ان کی کمزوری اور علالت کا دور چل رہا تھا، جس میں وہ صبح سویرے کسی سے ملتے نہیں تھے، ان کی صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کو اس وقت بڑی زحمت ہوتی تھی، ہم لوگوں کو یہ معلوم تھا، اسی دوران ایک صبح سویرے ان کے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک تعلق والے صاحب آئے جو وقتاً فوقتاً آیا بھی کرتے تھے، کوئی خاص بات نہ تھی، انہوں نے سویرے ہی مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو بتادو کہ میں آیا ہوں، میں نے کہا کہ ابھی وہ اس حال میں نہیں ہیں، تھوڑی دیر کے بعد بتادوں گا، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ان کو اطلاع دی، انہوں نے ان کو بلایا، اور دریافت کیا کب آنا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ صبح سویرے۔ فرمایا کہ ہم کو

www.abulhasanalinadwi.org

اطلاع نہیں کی، انہوں نے کہا کہ رابع سے کہا تھا، چنانچہ مجھ کو طلب کیا، اور فرمایا: تم نے کیوں نہیں اطلاع کی؟ کیا تم کو ان کا تعلق معلوم نہیں؟ یہ اشارہ والد صاحب سے ان کا تعلق ہونے کا تھا، کیونکہ اس تعلق کے بغیر کوئی اور صاحب ہوتے جن سے ملنے کی ذمہ داری شرعی طور پر نہ ہوتی تو اس کے ساتھ اپنی سہولت کے لحاظ سے ہی معاملہ کرتے، اس کے ساتھ عزیز وقریب جیسا اخلاق نہ برتتے، چنانچہ کوئی عام آدمی جب ان کی طرف سے یہ فرق دیکھتا تو اس کو ان کے اس طریقہ کو نہ جاننے کی وجہ سے غلط فہمی ہوتی، اور بعض وقت اس فرق پر تعجب بھی ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ شریعت کے طے کردہ اخلاق وصفات کی حتی الوسع پوری پابندی کرنے کے ساتھ وضع قطع میں بھی اس کی پوری پابندی کرتے، انہوں نے دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسکول وکالج ویونیوسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ اندازہ کرلیا تھا کہ انگریزی نظام تعلیم میں پڑھنے کے بعد اخلاق وصفات پر ایک اثر ضرور پڑتا ہے، جس کے نتیجہ میں ذہن کی تشکیل دین کی اہمیت کے ساتھ اس طرح نہیں ہوتی جس طرح دینی ومشرقی ماحول میں ہوتی ہے، وہ اس کا ذکر کرتے تھے، اور باوجود دین وشریعت پر پورے عامل ہونے کے ایک بار یہ تک کہا کہ مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا، اس طرح وہ یہ توجہ دلاتے تھے کہ جدید نظام تعلیم سے استفادہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے ماحول کو ایسا بنانا ضروری ہے کہ ذہن کی اسلامی خصوصیت پر کوئی اثر نہ پڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے دین ودنیا کو، قدیم وجدید کو اور علم وعمل کو اپنی زندگی میں اس طرح باہم آمیز کرلیا تھا کہ بڑی حد تک انہوں نے اس کا ایک غیر معمولی نمونہ پیش کردیا، جو ایک طرف علوم دینیہ پر عبور رکھنے والے عالم اور دوسری طرف علوم جدیدہ کے ماہر تعلیم یافتہ تھے اور اس طرح انہوں نے یہ دکھایا کہ آدمی عزم وبلند ہمتی اور اخلاص عمل

www.abulhasanalinadwi.org

سے کام لے تو وہ اس جامعیت کو پیش کر سکتا ہے، جس کی تلقین اسلام کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں علم کو عملی شکل دینے کی طرف توجہ رہتی تھی، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ زندگی کے جائز اور لازمی تقاضوں کو پورا کرنے میں انہوں نے اپنے کو دوسروں کا محتاج نہیں بنایا تھا، اپنی صحت کے زمانہ میں جو کام دوسرے لوگ کر سکتے ہیں وہ اپنی صحت وقوت کے زمانہ میں خود بھی کر لینے کی صلاحیت پیدا کرتے تھے، ان کی زندگی میں عملی پہلو کا بڑا لحاظ تھا، وہ دوسروں سے بھی یہ چاہتے تھے کہ علم کو عمل سے جوڑیں اور زندگی میں خود کفالتی اور حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کریں، ایک بار انہوں نے اپنی ایک صاحبزادی سے فرمایا: کہ "شیروانی جس کو سمجھا جاتا ہے کہ درزی کے علاوہ کوئی سی نہیں سکتا، تم سی کر دیکھو" اور ان سے ایک شیروانی سلوائی، جو استعمال بھی ہوئی، یہ ایک بار ہی کیا، لیکن اس طرح یہ ذہن بنایا کہ کسی کام میں جو زندگی کی ضرورت کا ہے، محض دوسروں کا دست نگر ہونا صحیح نہیں ہے۔

شریعت کے احکام پر عمل کرنے میں خود بھی نمونہ بنتے تھے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے تھے، شادیوں میں رسم ورواج کے سخت مخالف تھے اور حدیث شریف میں آئے ہوئے طریقہ پر عمل کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ اپنی صاحبزادیوں کی شادیوں میں سادہ طریقہ سے نکاح پر عمل کرتے رہے تھے اور دامادوں کے انتخاب میں دین سے تعلق ہی پر اکتفا کیا اور دنیاوی توقعات پر نظر نہیں ڈالی، حالانکہ ایک مقبول اور خوش حال ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیاوی راحت اور عزت کے پہلو کو ترجیح دیتے تو تعجب نہ تھا، چنانچہ انہوں نے کسی بیٹی کے نکاح کے وقت اس کا خیال نہیں کیا کہ اختیار کردہ داماد کے اقتصادی توقعات مبہم ہیں، نکاح سے قبل اپنے ہونے والے داماد کے سرپرست سے کہہ دیتے کہ برات نہیں آئے گی، یا اس طرح کا کوئی اہتمام نہ

www.abulhasanalinadwi.org

ہوگا، اسی طرح داماد وغیرہ کے لئے کسی کپڑے جوڑے کا بھی مطلق انتظام نہ کرتے اور اس سلسلہ میں عزیمت یہاں تک دکھائی کہ اپنے بیٹے محمد میاں کی شادی کے موقع پر جب کہ وہ اپنی بہنوں کے درمیان تنہا تھے، یہ فرمایا: کہ ''برات نہیں جائے گی اور بیٹے سے کپڑے اور جوتے کے سلسلہ میں فرمایا کہ کوئی اہتمام نہ ہو، جو سادہ سے سادہ انتظام ہو، وہ کیا جائے، فرماتے: ''دکھاوے اور اظہار شان کی کوئی ضرورت نہیں، اسی کے ساتھ ساتھ بھائی اور بیٹے بیٹی سے تعلق ومحبت کے جو جائز اور فطری تقاضے ہیں، وہ پوری طرح محسوس کرتے تھے اور اس کا عملاً اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے ضرورت کا خرچ کرنے میں بالکل کوتاہی نہیں کرتے تھے، ان کو اپنے بیٹے اور اپنے بھائی سے جو محبت تھی وہ بعض وقت صاف ظاہر ہوجاتی تھی، لیکن اس میں ایک دوسرے کے معاملہ میں بے انصافی نہیں ہوتی تھی۔

انگریزی تعلیم بھرپور طریقہ سے حاصل کرنے کے بعد جب کہ ان کے زمانہ میں انگریزی تمدن وترقیات سب مشرقی ملکوں کے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کررہی تھیں اور انگریزی تہذیب کے سامنے مرعوبیت عام تھی، ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دینی تعلیمات اور مشرقی وشرعی وضع اور اسلامی حمیت اور دینی خیالات پر قائم رہنا اور عمل کرنا، ایک غیر معمولی بات تھی، جب کہ مغربی تعلیم وتمدن اور ترقیات اور ان کی مختلف پہلوؤں میں فائدہ مندیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے، ان کے سمجھنے میں کمی نہیں رکھتے تھے، اس طرح دین ودنیا کی خوبیوں کو انہوں نے باہم جمع کرلیا تھا اور اسلام کے بتائے ہوئے طریقے وطرز عمل کو اچھی طرح اختیار کیا تھا۔

مذکورہ بالا پہلوؤں کی خوبیوں کے حامل ہونے کی بنا پر یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی متنوع صفات کی اور متوازن شخصیت، ہمارے

www.abulhasanalinadwi.org

مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے اہم نمونہ کی حیثیت رکھنے والی شخصیت تھی، اسی کے ساتھ ساتھ وہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے حضرات کے لئے بھی قابل تقلید ہے، ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے وقت تعلیمی وتربیتی حکمت عملی سے ایسے افراد تیار کرنے کو مقصد بنایا تھا جو عہد حاضر کی دشواریوں اور تقاضوں سے بھی واقف ہوسکیں اور دینی قدروں اور شرعی ہدایتوں کے بھی پورے پابند ہوں، نئے حالات وترقیات سے مرعوب نہ ہوں اور اسلامی فکر وکردار کو ہر عہد کے لئے سودمند اور لائق اتباع سمجھتے ہوں اور یہی فکر وکردار وہ فکر وکردار ہے جس کی نمایاں جھلک ڈاکٹر صاحب میں پائی جاتی تھی، چنانچہ ان کی شخصیت کے یہ تاباں پہلو ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے لائے جانے کی ضرورت تھی، ان کی سیرت وسوانح کے ذریعہ یہ کام انجام پاسکتا تھا، لیکن اب تک ایسا نہیں ہوسکا تھا، اب یہ کام ان کے بھائی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس سوانحی خاکہ کو جو ''حیات عبدالحی'' میں ان کے متعلق ضمناً آیا ہے، مستقل کتاب بنا کر انجام دیا جارہا ہے، اس میں بعض دوسری تحریریں بڑھادی گئی ہیں تاکہ زیادہ سودمند ہو، اس طرح ان کی سوانح مستقلاً تصنیف بن کر سامنے آرہی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو مفید تر بنائے، (آمین)۔

۶/۱/۱۴۲۵ھ — محمد رابع حسنی ندوی

۲۷/۲/۲۰۰۴ء — ندوۃ العلماء لکھنؤ

www.abulhasanalinadwi.org

باب اول

خاندان، جدامجد اور والد ماجد

خاندان

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو ایک طویل زمانہ سے علمی و دینی خدمات انجام دے رہا تھا، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ میں شاید کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں کوئی مصلح، مصنف اور داعی نہ پیدا ہوا ہو، درمیان میں اس میں ایسے ایسے مجددین اور حاملینِ دعوت بھی پیدا ہوئے جنھوں نے بعض مرتبہ صدیوں تک فکری قیادت کی، اور جن کی تجدید و اصلاح کی فکر و دعوت کو لے کر عرصہ تک کام کرنے والے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

اس سلسلۃ الذہب کی سب سے پہلی کڑی جس نے ہجرت و جہاد اور اصلاح کے ارادے سے ہندوستان کا رخ کیا وہ امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد المدنیؒ کی ذات تھی، جو چھٹی صدی کی ابتدا میں اپنے ہزاروں معتقدین کے ساتھ تشریف لائے اور ''کڑہ مانک پور'' کے نواح میں جہاد کر کے اس ظلمت کدہ کو نور اسلام سے منور کیا، امیر قطب الدین مدنیؒ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بھانجے اور

www.abulhasanalinadwi.org

بیک واسطہ خلیفہ تھے، براہ راست بھی شیخ سے استفادہ کیا تھا، جلیل القدر اولیاء اللہ میں سے تھے، کڑہ ہی میں وفات پائی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے، سلطان قطب الدین ایبک آپ کا دست گرفتہ اور معتقد تھا۔

امیر قطب الدینؒ کی اولاد میں اتنے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں اس کی مثال ملے گی، ان کے حفید سعید قاضی سید رکن الدینؒ بڑے بلند پایہ تھے، پھر ان کی اولاد میں حضرت قاضی سید احمد نصیر آبادیؒ بڑے باحمیت اور صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کے پوتے حضرت سید محمد فضیلؒ بھی زہد و ریاضت اور اتباع سنت میں مرتبہ عالی رکھتے تھے، دوسرے پوتے حضرت سید محمد اسحاقؒ بھی عارف کامل تھے، ان کے صاحبزادے دیوان خواجہ احمد نصیر آبادیؒ زبردست عالم اور صاحب سلسلہ شیخ طریقت تھے، حضرت سید محمد فضیلؒ کے صاحبزادہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ اس سلسلۃ الذہب میں اپنی ایک شان رکھتے ہیں، آپ حضرت سید آدم بنوریؒ کے اجلہ خلفاء میں سے تھے، اتباع سنت میں دور دوران کی نظیر ملنی مشکل ہے(۱)، شاہ صاحبؒ کی اولاد میں حضرت مولانا سید محمد جیؒ، حضرت لعل شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد حیاءؒ، حضرت مولانا سید محمد صابرؒ، حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ، حضرت شاہ محمد واضح صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد قطب الہدیٰ محدثؒ، حضرت مولانا سید محمد ظاہرؒ اور حضرت شاہ ضیاء النبیؒ بڑے بلند پایہ گزرے ہیں، لیکن ان میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شہید احمد شہیدؒ کی ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ کی چوتھی پشت میں ہیں، ان کے انفاس قدسیہ سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہونچا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان کی برکات سے وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو علم و عرفان کی روشنی سے فیضیاب نہیں۔(۲)

(۱) ملاحظہ ہو "تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ" از مولانا سید محمد الحسنیؒ۔(۲) ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" (۱-۲) از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور "سید احمد شہید" از مولانا غلام رسول مہر۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت سید محمد اسحاقؒ کے دوسرے صاحبزادے سید ہدایت اللہؒ بلند پایہ عالم تھے، عہد شاہجہانی میں امور مذہبی کے صدر الصدور تھے، ان کی چھٹی پشت میں مولانا سید عبد العلیؒ ایک درویش سیرت فاضل بزرگ گزرے ہیں، جو سید احمد شہیدؒ کے مرید و مجاز تھے، خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب ڈاک سامنے آتی تو نامۂ اعمال یاد کر کے گریہ طاری ہو جاتا، نقاشی و خوشخطی کا اعلیٰ ذوق تھا، زیادہ تر آمدنی مستحقین پر صرف کر دیتے، ''دست بکار دل بیار'' کا نمونہ تھے، اخلاق کریمانہ کے ساتھ زندگی گزار دی اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں فالج کے مرض میں انتقال فرمایا، آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ ''ھو الرفیق الأعلیٰ'' تھا۔

جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ

حضرت کے جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ انہیں مولانا عبد العلی صاحبؒ کے فرزند ہیں، دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ کو ولادت ہوئی، والد محترم کا کم سنی میں انتقال ہو گیا، اپنے نانا مولانا محمد ظاہرؒ کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی، تعلیم کی تکمیل مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے درس میں ہوئی، طب اور شاعری میں بھی رسوخ پیدا کیا، مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی، صبر و قناعت کی صفت ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور ان کو چھو کر نہیں گیا تھا۔

راجپوتانہ، حیدر آباد، بھوپال اور ٹونک میں ملازمت کی خاطر طویل قیام فرمایا، خاص طور پر حیدر آباد کے مختلف اضلاع میں آٹھ سال تک صدر مدرسی کرتے رہے لیکن ملازمت سے کبھی مناسبت نہیں رہی، اسی لئے کہیں مستقل قیام نہ ہو سکا، آخری سفر ٹونک کا ہوا، نواب ابراہیم علی خاں نے صیغۂ طبابت سے مشاہرہ مقرر کر دیا،

www.abulhasanalinadwi.org

ڈیڑھ سال قیام کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں پوری زندگی گزار دی۔

بیعت وطریقت اپنے پھوپھا حضرت خواجہ احمد صاحبؒ سے کی تھی، اجازت سے بھی سرفراز کئے گئے، حضرت مولانا محمد ظاہر صاحبؒ نے بھی اجازتِ بیعت مرحمت فرمائی تھی، مگر کبھی پیری مریدی نہیں کی، ذکر وشغل طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق کرتے، کتب بینی اور تصنیف وتالیف سے خاص مناسبت تھی، تاریخ کا بڑا اچھا ذوق تھا، درس وتدریس کا بھی سلسلہ جاری رہتا، فارسی، اردو میں متعدد تصانیف اور دیوان یادگار ہیں، عربی میں بھی بعض تصانیف موجود ہیں، اشعار بھی کبھی کبھی عربی میں رقم فرمایا کرتے تھے۔

تصانیف میں سب سے زیادہ اہم ''مہر جہاں تاب'' ہے جو فارسی میں ہے، پہلی جلد فل اسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے، جس میں تین دفتر ہیں، دفتر اول میں علوم وفنون، متعارف وغیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں، دفتر دوم میں انبیاء کرام، اہل بیت، صحابہ، تابعین، علماء، حکماء اور مشائخ کے حالات جدا جدا قلم بند فرمائے ہیں، تیسرے دفتر میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے شاعروں کے حالات ہیں، دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی، جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا اور جلد آدھی ہو چکی تھی کہ ان کو یہ احساس ہوا کہ جس زبان میں وہ یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کا زمانہ نے ورق الٹ دیا ہے، اس سے ان کی ہمت پست ہوگئی، مگر پھر دوبارہ ہمت کر کے اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا، اس کے بارہ جزء ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ گیا۔

طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا، اظہارِ کمال سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا اور اپنے تمام تر علمی وعملی کمالات کے باوجود گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے، وفات کا حال خود صاحب حال کے باکمال فرزند مولانا حکیم سید

www.abulhasanalinadwi.org

عبدالحی حسنیؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے:

''وفات کی رات کو نبض ساقط ہوگئی، سوائے سانس کی آمد و شد کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی، رات کو دس بجے یک بیک جنبش پیدا ہوئی، دائیں پہلو کی طرف خود بخود جھک گئے اور قلب جاری ہوگیا اور اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلہ سے لفظ اللہ سنا جاسکتا تھا، ایک بجے رات تک یہ حال رہا، پھر اضمحلال پیدا ہوگیا، اس وقت فقیر نے حاضر الوقت اصحاب سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھیں، اس کے شروع ہوتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہوگیا، پھر حاضرین نے تلقین شروع کی اور حضرت نے ذکر لسانی شروع فرمادیا اور اسی حال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، یہ واقعہ ۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ کا ہے۔''(۱)

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ ہندوستان کے مایہ ناز مؤرخ، صاحبِ ذوق محدث اور صاحبِ دل عالم تھے، ۱۸ر رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ میں دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ولادت ہوئی، نانی صاحبہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھیں اور بڑی عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، بچپن کا کچھ حصہ ان کی آغوشِ تربیت میں گزرا، خود مولانا فرماتے ہیں کہ ''میری نانی صاحبہ مجھے لوری سنا سنا کر سلاتی تھیں۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب

یہ افضل سے افضل عبادت نصیب(۱)

بچپن ہی سے نہایت سنجیدہ مزاج، خاموش اور متین تھے، نہ کسی کا دل دکھایا،

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۱۔

www.abulhasanalinadwi.org

نہ لڑے جھگڑے۔

ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں ہوئی جو آپ کا نانیہال تھا، فارسی منشی محمد طلیق سے پڑھی جو رشتہ کے ماموں، مولانا شاہ عبدالسلام صاحبؒ کے مرید تھے، ابتدائی عربی تعلیم خود شاہ صاحب ممدوح سے حاصل کی، پھر جب دادیہال قیام رہنے لگا تو حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ سے ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں، رائے بریلی کے قیام میں کچھ دن انگریزی بھی پڑھی، پھر الہ آباد تشریف لے گئے اور مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ سے تعلیم حاصل کی، کچھ مہینوں کے لئے فتحپور میں رہ کر مولانا نور محمد صاحبؒ سے فقہ کی کوئی کتاب پڑھی، ۱۳۰۱ھ میں والد مرحوم کے پاس پھر بھوپال تشریف لے گئے، دو سال وہاں رہ کر مختلف علماء سے تحصیلِ علم میں مشغول رہے، ۱۳۰۳ھ کے وسط میں واپس تشریف لے آئے اور کچھ دن وطن میں رہ کر تحصیلِ علم کے لئے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ میں آپ نے مولانا امیر علی صاحبؒ، مولوی الطاف حسین صاحبؒ، مولوی فتح محمد صاحب تائبؒ، مولانا فضل اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد نعیم صاحبؒ فرنگی محلی سے کتب درسیہ پڑھی، فراغت کے بعد وطن تشریف لائے اور اسی دوران آپ کا نکاح ہوا اور اس کے بعد کچھ دن وطن میں قیام رہا پھر تعلیم کی تکمیل کے لئے بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں قاضی عبدالحق صاحبؒ سے باقی کتب درسیہ پڑھیں، مولانا سید احمد دیوبندیؒ سے ریاضی پڑھی اور شیخ محمد عربؒ سے ادب کی تکمیل کی، ان کے والد نامدار شیخ حسین بن محسن یمانیؒ سے حدیث پڑھی اور اجازت لی، شیخ کو آپ سے بڑی محبت تھی، آپ کی فرمائش پر شیخ نے بعض رسائل بھی تصنیف فرمائے۔

طب کی تعلیم حکیم عبدالعلی صاحبؒ اور حکیم عبدالعزیز صاحبؒ کے یہاں مکمل ہوئی۔

طالب علمی ہی کے دور میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ

www.abulhasanalinadwi.org

سے بیعت کا تعلق قائم فرمایا اور حضرت نے خصوصی توجہ فرمائی لیکن ان سے زیادہ استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، اس لئے منازلِ سلوک اپنے خسر حضرت شاہ ضیاء النبیؒ اور والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ کی خدمت میں طے کئے، شاہ عبد السلامؒ کے خلفاء مولانا امین الدین کنتھویؒ اور جناب قدرت علی صاحبؒ سے بھی اس سلسلہ میں فیض حاصل کیا، مذکور الصدر تینوں بزرگوں نے آپ کو اجازتِ بیعت مرحمت فرمائی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی مراسلت کے ذریعہ سے استفادہ کیا اور انہوں نے بھی اپنے مکتوب میں آپ کو اجازت دی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حساس دل عطا فرمایا تھا، اصلاح و انقلاب کی جو کوششیں کی جاتیں، دل و جان سے ان کا تعاون فرماتے، طالب علمی ہی کے دور میں دار العلوم کے ابتدائی جلسوں میں شرکت فرمائی، پھر فارغ ہونے کے بعد وطن میں ''انجمن آل ہاشم'' کی بنیاد ڈالی، پھر شوال ۱۳۱۳ھ سے باقاعدہ دار العلوم کی خدمت کا آغاز فرمایا اور ایک مدت تک بلا کسی معاوضہ کے صبر و استقلال کے ساتھ معاون ناظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، بعد میں ارکان کے اصرار پر معاوضہ لینا قبول فرمالیا، اس دوران تعلیم ادب و افتاء کا کام بھی کرتے رہے، اپنی مسجد میں وعظ بھی فرماتے، دس سال تک یہی سلسلہ رہا پھر معاوضہ ترک فرمادیا اور حصولِ معاش کے لئے مطب شروع کیا، اس میں بھی خدمت ہی مقصود تھی۔

جب دار العلوم میں انتشار شباب کو پہونچا تو بالاتفاق ۱۳/اپریل ۱۹۱۵ء میں نظامت کے لئے آپ کا انتخاب ہوا، نظامت کا ابتدائی دور گزشتہ اختلافات کے اثرات کو دور کرنے، ملک میں ادارہ کا وقار بحال کرنے اور مالی بحران دور کرنے میں گذرا، پھر آپ نے تعلیم و تربیت کی طرف توجہ فرمائی لیکن پیغام اجل آ گیا اور آپ کو

www.abulhasanalinadwi.org

اس کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔

خلوت پسندی، وقار، کم گوئی، صبر، تواضع، فنائیت، تسلیم و رضا، جود وسخا، سلامتِ طبع جیسے اخلاق میں آپ کو امتیاز حاصل تھا۔

والدین کے مطیع و فرمانبردار، اہل و عیال پر شفیق تھے، جو اعزہ و احباب حاجت مند ہوتے ان کے ساتھ سلوک وصلہ رحمی فرماتے کہ گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوتی، خاندان کے حقوق ادا کرنے کا بڑا خیال رہتا، آپ کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچی، دوسروں کا دل دکھانا گویا آپ کے مسلک میں کفر تھا، والد کے احباب اوران سے تعلق رکھنے والوں کا آپ کو بہت خیال رہتا۔

دن بھر کی آمدنی رات تک خرچ کرنا ضروری سمجھتے اور رات کو روپیہ باقی رکھنا برا سمجھتے تھے۔

زیادہ وقت کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا تھا، تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا، تفسیر وحدیث، ادب اور طب کا درس دیتے تھے، درس حدیث کا سلسلہ آخری دن تک جاری رہا اور وفات کے دن بھی اس میں ناغہ نہیں ہوا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آپ سے ''مقامات'' کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔

نوافل میں اقتصاد پسند فرماتے، اتباع سنت کا غایت درجہ اہتمام تھا، مشتبہ مال سے حد درجہ اجتناب تھا، فکر میں بڑا توازن تھا، ذکاوت و ذہانت میں ممتاز تھے، طبیعت ایسی سلیم تھی کہ ہر چیز کی اہمیت اسی تناسب سے سمجھتے جس تناسب کو فطرت نے قائم کر دیا ہے۔

اردو، فارسی، اور عربی ادب میں بلند پایہ رکھتے تھے، تاریخ سے خاص لگاؤ تھا، اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا، تفسیر وحدیث کا اچھا ذوق تھا، اخیر میں حدیث کی اتنی مزاولت بڑھ گئی تھی کہ تاریخ کا ذوق بھی ماند پڑ گیا تھا، اخیر میں

www.abulhasanalinadwi.org

یہ بھی تمنا تھی کہ فرزند اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ فارغ ہوں تو ان کو مطب میں بٹھا کر خود بقیہ زندگی درسِ حدیث میں مشغول رہ کر وطن میں گزار دیں، فقہی مسائل میں بھی فیصلہ کن رائے رکھتے تھے۔(۱)

۱۵ر جمادی الآخرۃ ۱۳۴۱ھ مطابق ۲ر فروری ۱۹۲۳ء میں اچانک رحلت فرمائی، بقول حضرتؒ (مولانا علی میاں) کے ''وہ چراغ گل ہوگیا جس کی روشنی میں لوگوں نے اسلاف کے مٹے ہوئے نقش قدم اور کاروانِ رفتہ کے دھندلے نقوش، سلف صالحین وعلماء متقدمین کے کتنے کارنامے جو تہہ در تہہ پردوں میں چھپے پڑے تھے، کاغذ کے صفحات پر دیکھے اور آئندہ نسلیں بھی ان کو دیکھتی رہیں گی، وہ چراغ جو ثلث صدی تک دلوں کو حرارت ونور سے بھرتا رہا اور حلقۂ احباب ہی میں نہیں، بزم علم ودین میں بھی شمعِ انجمن بنا رہا۔''

آپ نے اپنے پیچھے متعدد شاہکار تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا جن میں ممتاز ترین کتاب ''نزھة الخواطر'' ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار باکمال مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے، کتاب اپنی وسعت و جامعیت، حسنِ انتخاب، مؤرخانہ دیدہ وری، پھر زبان کی حلاوت و چاشنی میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے، اس کے علاوہ ممتاز کتابوں میں ''الهند في العهد الإسلامي'' اور ''الثقافة الإسلامية في الهند'' بھی شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں، حدیث میں ''تلخيص الأخبار'' کے نام سے ایک بہترین انتخاب فرمایا پھر اس کی دو جلدوں میں بڑی لطیف شرح فرمائی۔ ''تلخيص الأخبار، تهذيب الأخلاق'' کے نام سے بار بار شائع ہوئی اور داخل نصاب کی گئی۔ ''منتهى الأفكار (شرح تلخيص الاخبار)'' بھی انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائے گی، غناء وسماع پر ایک بھرپور رسالہ تحریر

(۱) انتخاب وتلخیص ''ترجمہ مصنف'' یادایام از مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

فرمایا تھا جو "الغناء في الإسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد رسائل وتصنیفات یادگار ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ نے دو شادیاں کیں، پہلی اہلیہ مولانا سید عبدالعزیز صاحب ہنسویؒ کی دختر مخدومہ سیدہ زینب صاحبہ تھیں، مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ کی ولادت ان ہی کے بطن سے ہوئی، ڈاکٹر صاحب کی عمر صرف پانچ سال کی تھی کہ ان کی وفات ہوگئی، اس کے بعد آپ نے والد ماجد کے حکم سے حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی صاحبزادی مخدومہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ سے عقد فرمایا، ان سے دو صاحبزادیاں سیدہ امۃ العزیز صاحبہؒ (والدہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ، مولانا محمد رابع حسنی، مولانا محمد واضح حسنی مدظلہما) اور سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ (مترجمہ زادسفر) اور ایک فرزند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔(۱)

●●●

(۱) تلخیص از حیات عبدالحی مختصر اضافوں کے ساتھ۔ (بلال عبدالحی)۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب دوم

ولادت سے وفات تک

ولادت وطفولیت

مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ۲۲ رجمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ (۱) (یکم دسمبر ۱۸۹۳ء یکشنبہ) کو اپنے نانیہال ہسوہ ضلع فتحپور کے محلّہ درگاہ میں پیدا ہوئے، آپ کے نانا مولوی سید عبدالعزیز صاحب اور آپ کے ماموں مولوی سید ابوالقاسم صاحب تھے، بچپن کا بیشتر حصہ نانیہال (ہسوہ ضلع فتحپور) اور دادیہال میں اپنے جد بزرگوار مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی کے سایۂ عاطفت میں گذرا، دونوں جگہ علمی وروحانی ماحول تھا، اس لئے آپ کو نیک صحبتوں، سنجیدہ اور ادب آموز مجلسوں کے وہ بہترین مواقع میسر آئے جو اس زمانہ کے شریف زادوں اور ہونہار بچوں کو میسر آسکتے تھے، ہسوہ ہی میں آپ کی تسمیہ خوانی ہوئی اور قرآن شریف اور اردو کی ابتدائی تعلیم ہوئی، ہسوہ میں اس وقت ایک بابرکت بزرگ اور حقانی عالم مولوی عبدالحکیم صاحب (م ۱۹۲۱ء) تھے، وہ کیرانہ ضلع

(۱) اسی سنہ میں ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز اور اس کی تاسیس عمل میں آئی، اس طرح وہ ندوۃ العلماء کی تحریک کے معاصر اور ہم عمر ہیں اور انہوں نے بہت کچھ اس ہم عمری کا حق ادا کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

مظفر نگر کے رہنے والے تھے، بیعت کا تعلق حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اور تلمذ کا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے تھا، انہیں کے مسلک و پرتو پر تھے نیز مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، انہیں کے پاس مکتب نشینی ہوئی اور اپنے دوسرے ماموں زاد بھائیوں اور قصبہ کے بچوں کے ساتھ تعلیم میں مشغول ہوئے، ڈاکٹر صاحب مرحوم آخر عمر تک مولوی صاحب کا ذکر نہایت بلند الفاظ میں کرتے تھے اور ان کی شخصیت و سیرت کا اثر ان پر باقی تھا۔

ابھی آپ کی عمر آٹھ ہی سال کی تھی کہ آپ کی والدہ صاحبہ نے ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء میں ایک مختصر علالت کے بعد اچانک انتقال کیا، اس وقت سے آپ اپنی نانی صاحبہ کی تربیت و نگرانی میں آ گئے، پھر جب ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں آپ کے والد ماجد نے دوسرا عقد کر لیا تو آپ اپنی نئی والدہ سے ایسے مانوس ہو گئے اور انہوں نے بھی ایسی مادرانہ شفقت کا برتاؤ کیا کہ دیکھنے والوں کو مرحوم والدہ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔

ہسوہ میں آپ نے قرآن مجید کا ناظرہ ختم کیا اور آگے کی تعلیم شروع کی، والد صاحب خطوط کے ذریعہ برابر تعلیمی ہدایات دیتے رہتے تھے، یہاں ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس پر ۱۵؍ جولائی ۱۹۰۲ء کی ڈاکخانہ کی مہر ہے، اور لکھنؤ سے ہسوہ بھیجا گیا ہے، یہ اس وقت کا خط ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف ختم کر لیا اور فارسی کے بجائے عربی شروع کر دی تھی، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”جانِ پدر! میں نے سنا ہے، کہ قرآن مجید تمہارا ختم ہو گیا، الحمد للہ اس سے زیادہ خوشی کس بات سے ہو سکتی ہے، یہ بھی سنا کہ تم نے میزان شروع کی ہے، تمہارے اس شوق و رغبت سے طبیعت خوش ہوئی، خدا نظر بد سے بچائے، مگر ابھی میزان پڑھنے کا وقت نہیں آیا،

www.abulhasanalinadwi.org

اس میں وقت زیادہ صرف ہوگا اور آئے گا (کچھ) نہیں، تم فوراً میزان چھوڑ دو اور بجائے اس کے اصول فارسی شروع کرو، میں اس کو بھیجتا ہوں، صبح کو پہلے تلاوت قرآن شریف کی مکتب میں جا کر کرو، ربع سے کم نہ ہو، اسکے بعد اصول فارسی پڑھو اور دوسرے وقت فارسی کی دوسری اور برابر لکھتے رہو کہ کس قدر ہوئی، اصولِ فارسی کو سمجھ کر پڑھنا اور زبانی یاد کرنا، علاوہ اس کے اپنا خط درست کرو اور فارسی رقعے لکھو، ان سب باتوں میں ایسی محنت کرو کہ ان سے جلد فراغت ہو جائے، پھر عربی شروع کرائی جائے گی اور حساب سیکھنے میں محنت کرو، اب تک تم نے نہیں لکھا کہ حساب میں کون قاعدہ سیکھتے ہو"۔

آپ کی آمد و رفت ہسوہ اور رائے بریلی کے درمیان برابر رہتی تھی، جب آپ فارسی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوئے تو اس خیال سے کہ آپ کے دادا صاحب فارسی کے جید عالم، ادیب و انشا پرداز اور اعلیٰ درجہ کے خوشخط تھے، والد صاحب نے یہ پسند کیا کہ ان کا زیادہ وقت دادا کے پاس گذرے تا کہ وہ ان سے استفادہ کر سکیں اور ان کی فارسی کی استعداد پختہ اور خط (جس کی طرف اس زمانہ میں خاص توجہ کی جاتی تھی) عمدہ ہو اور فارسی نثر و نظم اور خطاطی اور رقعہ نویسی کی اس زمانہ کے شرفاء کے دستور کے مطابق اچھی مشق بہم پہنچالیں، اس زمانہ میں آپ کے والد صاحب جن کا زیادہ وقت ندوۃ العلماء کی وجہ سے کانپور، شاہجہاں پور اور لکھنؤ میں گذرتا تھا، اس کی طرف برابر توجہ دلاتے رہتے تھے کہ وہ اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں، ان کے اس زمانہ کے خطوط نصائح سے پُر اور پدرانہ شفقت کے ساتھ حکیمانہ تربیت کا مرقع ہیں اور ان میں تعلیمی ہدایات، اخلاقی نصائح، اور ایک صاحب نظر عالم کے حکیمانہ مشوروں کا عطر آ گیا ہے، جو تعلیم و تربیت کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ اور ایک بڑی تعلیمی تحریک کے ذمہ داروں میں ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

ایک خط میں جو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) کو لکھا گیا ہے اور اس میں ''رائے بریلی'' دادا صاحب کے پاس جانے اور ان کی خدمت میں رہ کر فارسی وخطاطی کی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

''نورِ چشم عبدالعلی سلمہ تمہارا خط آیا، خوشی ہوئی، اس مرتبہ تم نے بہت دیر میں خط بھیجا، میں اچھا ہوں اور تمہاری کامیابی اور عمر واقبال وعلم وعمل کے لئے دعا کرتا ہوں، تمہاری تعلیم کے متعلق جو میں نے لکھا ہے، اس پر رائے بریلی جا کر عمل کرنا، پیارے! اب تمہاری مکتبی تعلیم کا وقت گذر گیا ہے، اب تمہیں طالب علمانہ طریقہ پر پڑھنا چاہئے۔

اگر تم نے والد ماجد دام ظلہ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا تو تم سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہوسکتا، اس زمانہ میں فارسی اٹھتی جاتی ہے اور میرے نزدیک وہ بہت ضروری چیز ہے اور خدا کی مہربانی سے تم کو اس کے حاصل کرنے کا عمدہ موقع ہے، والد ماجد سے بہتر اس کا جاننے والا دور دور تک کوئی نہیں، تم ان کی ایسی اطاعت کرنا کہ وہ تم کو دل سے پڑھائیں۔

واقعات نویسی کی مشق بھی کرنا اور وصلی پر خط کی بھی مشق کرنا، باقی عربی وحساب مولوی محمد احسن صاحب سے پڑھنا وسیکھنا، بریلی کے لڑکے بڑے کھلنڈرے ہیں، تم دل بہلانے کو کھیلنا مگر اتنا نہیں جس سے حرج ہو''۔

ڈاکٹر صاحب کی عربی، صرف ونحو کی تعلیم شروع ہوگئی تھی اور وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ ان سے فارسی میں خط وکتابت کی جائے چنانچہ قدیم خطوط میں ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۲۲ھ ۶ رجولائی ۱۹۰۴ء کا شاہجہاں پور سے لکھا ہوا پہلا (۱) فارسی خط ملتا

(۱) یہ بات قابل لحاظ ہے اور ڈاکٹر صاحب کی غیر معمولی صلاحیت اور ان کی آئندہ کامیابیوں کی ایک علامت، کہ انہوں نے اس چھوٹی سی عمر میں جب ان کا سن مشکل سے ۱۱ رسال کا تھا، انہوں نے ان خطوط کو محفوظ رکھا اور آج جب کہ سالہا سال کے بعد ان کا مختصر تذکرہ لکھا جارہا ہے، یہ خطوط کام آرہے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہے جس میں تعلیمی و تربیتی ہدایات و نصائح ہیں، وہ اس قابل کہ اس زمانہ کے طلبائے مدارس بھی اس کو دستور العمل بنائیں، یہاں درج کیا جاتا ہے:

''جان پدر! معلوم نیست کہ در پنج گنج و انوار سہیلی تا کجا رسیدند و در مطالعہ کتب زور طبیعت تا کجا یاری می دہد، جہد بلیغ نمائندہ کہ در مطالعہ عبارت را صحیح کردہ مطلبش نیک بفہمند، بر استاد اتکا نمودن کار کودکان خام است، شمارا کہ حق تعالیٰ بفضل خداوندی حوصلہ بلند عطا فرمودہ است بر استحصال مطلبے قناعت نورزیدہ مافوق را طلب نمودہ باشند و از صحبت کودکاں و زنان پرہیز نمایند۔

نخست موعظت پیرایں سخن است کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید، جگر پارۂ من! ادب را ہموارہ در ہر کار ملحوظ باید داشت ہمیں کلید بزرگواری و اقبال مندی است خودرا معتاد بے ادبی و بدتمیز ساختن معیوب است، واز شریف زادگان معیوب تر۔ از خدا جوید توفیق ادب بے ادب محروم شد از فضل اب تصویر خط و تصحیح املا و انشا از مہمات شما است ازاں غافل نباشد۔

''جان پدر! معلوم نہیں کہ تم نے پنج گنج اور ''انوار سہیلی'' کتنی پڑھ لی، مطالعہ میں دل لگتا ہے یا نہیں؟ اس کا پورا خیال رکھو کہ دورانِ مطالعہ مطلب پوری طرح واضح ہوتا جائے، استاد پر تکیہ کرنا نادان بچوں کا کام ہے، تم کو حق تعالیٰ نے حوصلۂ بلند عطا کیا ہے، اس لئے ایک مطلوب پر قناعت نہ کرنا بلکہ ہمیشہ مافوق پر نظر رکھنا اور عورتوں اور لڑکوں کی صحبت سے پرہیز کرنا۔

مرشد کی اولین نصیحت یہ ہے کہ صحبت ناجنس سے ہمیشہ دور رہنا۔ جگر پارۂ من! ادب کو ہر کام میں ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہی اقبال مندی و ترقی کی

www.abulhasanalinadwi.org

کلید ہے، اپنے کو بے ادبی و بدتمیزی کا عادی بنانا بہت معیوب اور شریف زادوں سے معیوب تر ہے، خدا سے ہمیشہ اس کی دعا کرتے رہنا چاہئے کہ ادب کی توفیق دے، خوشخطی، تصحیح املا اور انشاء تمہارے لئے بہت اہم چیز ہے، اس سے غفلت نہ ہونی چاہئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے دادا صاحب کی صحبت و تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بھی اپنے لختِ جگر کی پورے اہتمام سے تربیت فرمائی، ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہتے تھے: کہ "دادا صاحب نے مجھے ہر چیز کا عادی بنایا، بہت سے بچے بہت سی چیزیں نہیں کھاتے اور پھر عمر بھر ان کو اس سے تنفر رہتا ہے" کہتے تھے کہ "دادا صاحب مجھے فصل کی ہر چیز اور ہر قسم کی ترکاری اور کھانے کی ہر قسم کھلاتے تھے تاکہ ہر چیز کی عادت رہے اور ہر طرح کی زندگی گزارنے کی مشق ہو، فارسی کے ماسوا انہوں نے خطاطی کی بھی بڑی مشق بہم پہنچائی، وہ نسخ و نستعلیق دونوں بہت عمدہ اور شیریں لکھتے تھے اور پورے خطاط تھے، انہوں نے اپنے آبائی کتب خانہ کی مفصل فہرست اپنے قلم سے تیار کی، جس میں کتاب اور مصنف کے نام کے ساتھ کیفیت کے خانہ میں ضروری تفصیلات و معلومات بھی درج کیں، یہ فہرست جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود ہے، ان کی خوشخطی اور پاک نویسی کا نمونہ ہے، نیز مسجد دار العلوم کی دھوپ گھڑی پر جو مختصر عبارت ہے، وہ انہی کے قلم سے ہے، جو بعد میں کندہ کرادی گئی۔"

دار العلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم

ڈاکٹر صاحب اب عربی صرف ونحو اور ابتدائی کتابوں سے فارغ ہو گئے تھے، ادھر والد ماجد کا قیام (دفتر ندوۃ العلماء کے شاہجہاں پور سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے

www.abulhasanalinadwi.org

بعد) مستقل لکھنؤ رہنے لگا تھا اور ان کے مکان اور دفتر ندوۃ العلماء سے قریب ہی خاتون منزل گولہ گنج میں دارالعلوم تھا، اس لئے وہاں تعلیم کی تمام سہولتیں میسر تھیں اور والد ماجد کے تعلق سے تمام اساتذہ خیال کرنے والے تھے، ڈاکٹر صاحب نے وہاں کے فاضل اساتذہ سے پڑھنا شروع کیا، ادب عربی مولانا سید علی زینبی، فقہ واصول مولانا شبلی جیراجپوری فقیہ دارالعلوم، ہیئت مولانا سلطان محمد صاحب کابلی اور اقلیدس مولانا شیر علی حیدرآبادی سے، نیز بعض درسیات اپنے والد ماجد سے پڑھیں، ڈاکٹر صاحب ہمیشہ مولانا سید شیر علی صاحب حیدرآبادی کے طریقۂ تعلیم اور قابلیت کی تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ مسئلہ کی ساری تقریر مجھ سے کرواتے اور خود غلطی کی تصحیح اور استادانہ رہنمائی پر اکتفا کرتے، ان کا وہ طرز نہیں تھا جو آج کل مدارس میں عام طور پر رائج ہو گیا ہے کہ ساری ذمہ داری استاد پر ہوتی ہے اور وہی پوری تقریر کرتا ہے، طلبہ کی حیثیت اب صرف سامعین کی رہ گئی ہے۔

اس زمانہ میں سہیل یمانی، محدث جلیل شیخ حسین بن محسن انصاری (نزیل بھوپال) کی بھی لکھنؤ آمد ہوتی تھی اور وہ اپنے محبوب شاگرد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے یہاں مقیم ہوتے، ڈاکٹر صاحب نے ان کو اولیات سنا کر حدیث کی اجازت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند

اس وقت تک ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی ساری تعلیم وتربیت گویا گھر ہی پر اور بزرگوں اور سرپرستوں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی، ہسوہ اور رائے بریلی تو گھر ہی تھے، والد ماجد کے تعلق سے اساتذہ کی شفقت اور شہر میں ہونے کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی گھر ہی تھا، علمی ترقی اور بلند ہمتی کے ساتھ اکتساب فیض کے

www.abulhasanalinadwi.org

لئے دور جا کر اور اجنبی ماحول میں رہ کر علم کی تحصیل ہمیشہ سے مفید ثابت ہوئی ہے، اسی لئے ''سفر'' ہماری علمی و تعلیمی تاریخ کا ایک نہایت روشن اور ضروری عنوان رہا ہے اور عام طور پر انہی لوگوں نے علمی و عملی کمالات حاصل کئے ہیں جنہوں نے طویل طویل سفر اختیار کر کے نامور علماء و اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

شاید اسی وجہ سے نیز اس بناء پر بھی کہ دار العلوم دیوبند درس حدیث کا ایک بڑا مرکز ہو رہا تھا اور اس کی مسند درس پر مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند رونق افروز تھے اور والد ماجد ان کے اخلاص وللّٰہیت کے بڑے قائل تھے، اسی کے ساتھ یہ امید بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب جو بچپن سے نہایت کم سخن اور خاموش تھے، اس ماحول میں جا کر ان میں کچھ تقریری ملکہ پیدا ہوگا اور ان کی مہر سکوت ٹوٹے گی، انہی مقاصد کے پیش نظر دار العلوم ندوۃ العلماء سے استفادہ کے بعد والد ماجد نے مناسب سمجھا کہ حدیث کی تکمیل دار العلوم دیوبند جا کر کریں، چنانچہ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۰ء) میں آپ نے ان کو دیوبند بھیج دیا اور آپ اپنے چچا سید محمد صابر کے ساتھ، جو عمر میں آپ سے چھوٹے تھے، دیوبند روانہ ہو گئے۔

والد صاحب ایک خط میں جس پر ۸/دسمبر ۱۹۱۰ء (۱) کی تاریخ پڑی ہوئی ہے اور غالباً دیوبند پہنچنے کے بعد کا پہلا خط ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

''تم کو وہاں بھیجنے کا پہلا مقصد یہ ہے کہ مجھ سے کچھ دنوں علیحدہ رہو اور زمانہ کے نشیب و فراز کو سمجھو، دوسرے مولانا محمود حسن صاحب کی صحبت مغتنمات میں سے ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ، تیسرے دینیات کا اکتساب بطریقۂ احسن، چوتھے تمہاری بے زبانی کم ہو اور وعظ کہنے کی جرأت و سلیقہ پیدا ہو، اگر ان مقاصد کے حاصل کرنے

---

(۱) ۴/ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ

www.abulhasanalinadwi.org

میں تم کو کامیابی نہ ہوئی تو میرے لئے بڑی کوفت اور رنج وصدمہ کا باعث ہوگا۔''
اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے اور علم وعمل میں تم کو مجھ سے بدرجہا بہتر وبالاتر ترقی عطا فرمائے، سحر خیزی اور جماعت کا التزام محبت وشوق سے کرو یہ بڑی نعمت ہے،،۔

ایک دوسرے خط میں جس پر دیوبند کے ڈاکخانہ کی ۱۵؍جنوری ۱۹۱۱ء (۱) کی مہر ہے، لکھتے ہیں:

''اپنی ترقی تعلیم کیطرف متوجہ رہو، کچھ حرج نہیں اگر ''نسائی'' نہیں ہوئی، ''توضیح تلویح'' مقدمات اربعہ تک ضرور پڑھو، زیادہ ضروری کتابیں یہ ہیں، بخاری شریف، بیضاوی، مطول، ہدایہ، بخاری شریف مولانا محمود حسن صاحب سے پڑھنا، امید ہے کہ ترمذی کے بعد وہ بخاری پڑھائیں گے، باقی کتابیں جو پڑھ رہے ہو تمام ہوجائیں تو مندرجہ بالا کتابوں کے پڑھنے کا خیال رکھنا، بعد مطالعہ ومذاکرہ کے زیادہ وقت طلبہ سے مختلف مسائل پر مباحثہ کرتے رہو اس سے فائدہ ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ، اور وعظ کہنے کی مشق کرو، نماز پڑھانے کی عادت ڈالو، تمہیں وہاں بھیجنے کا مقصد یہی ہے کہ ہیاو نکل جائے، خدارا مجھے ناامید نہ کرنا، میں نے اللہ کے بھروسہ پر بہت سی توقعات تم سے وابستہ کرلی ہیں، مولانا محمود حسن صاحب کی ذات قدسی نمونۂ سلف ہے، ان کے اخلاق کا مطالعہ رکھو،،۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''تم منجملہ دیگر اسباق کے ترمذی شریف اور توضیح تلویح پر زیادہ محنت کرنا اور مطالعہ اچھی طرح کرنا، وہاں جانے اور سفر کی زحمت اٹھانے کا ماحصل یہی ہے، فتویٰ نویسی بہت توجہ سے کرنا اور فرائض کی تخریجوں کو خوب ذہن پر چڑھالینا، وہاں تقریر کے جو

---

(۱) ۱۳؍محرم ۱۳۲۹ھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

جلسے ہیں ان میں بھی باضابطہ شریک ہونا اور تقریر و وعظ کی مشق کرنا۔''

ڈاکٹر صاحب مرحوم جب دیوبند پہنچے تو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان کی نسبت اور مولانا حکیم سید عبدالحی کے تعلق سے مولانا محمود حسن صاحبؒ نے ابتدا میں اپنے ہی پاس ٹھہرایا اور اپنا مہمان بنایا، ڈاکٹر صاحب کہتے تھے: کہ ''حضرت کھانا خود اپنے ہاتھ سے لے کر آتے، ان کا یہ تکلف اور تکلیف دیکھ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ کہیں اور رہنے کا انتظام کیا جائے چنانچہ کمرہ ۴۶ میں منتقل ہو گئے، والد ماجد کے خطوط پر پتہ ''مدرسہ عربی کمرہ ۴۶ دیوبند'' ہی ملتا ہے۔''

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب جنہوں نے مختلف اساتذہ اور درسی حلقوں سے استفادہ کیا تھا اور سب سے یکساں نیازمندی و منت شناسی کا تعلق رکھتے تھے اور یہ اس قدیم نظام تعلیم کا ایک شعار بھی تھا، اس بات کی ضرورت سمجھتے تھے کہ سعادتمند فرزند کا اپنے قدیم اساتذہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بدستور تعلق قائم و برقرار رہے اور وہ حضرات ان کے دیوبند جانے سے یہ محسوس نہ کریں کہ وہ اب ان سے مستغنی و بے تعلق ہو گئے اور وہ شاگردانہ و استادانہ تعلق اب منقطع ہو گیا، یہ علمی و اخلاقی تربیت کا بڑا نکتہ تھا جس پر ان جیسے صاحب نظر اور شریف الطبع انسان کی نظر ضرور پڑنی چاہئے تھی چنانچہ ایک خط کے آخر میں جو دیوبند کے قیام کے زمانہ کا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''مکرر آنکہ ایک ایک خط تم مولانا سید شیر علی صاحب و مولوی سید علی صاحب و مولوی محمد شبلی صاحب کو بھیج دو، جس میں اپنے پہنچنے کا حال لکھو اور مولوی شیر علی صاحب کو لکھنا کہ میری تمنا ہے کہ میں یہاں سے فارغ ہو کر پھر جناب کی کفش برداری کروں اور آپ کے انفاس متبرکہ سے فائدہ اٹھاؤں۔''

اسی طرح مولانا محمود حسن صاحب سے بھی ان کے شاگرد رشید کا ایسا ہی تعلق رہا،

www.abulhasanalinadwi.org

دیوبند سے فارغ ہوکر چلے آنے کے بعد تک مولانا کو ان کے علمی و دینی مشاغل اور اس مقصد میں مشغول ہونے کی فکر رہی، جس کے لئے سب تعلیم و تعلم کا سلسلہ اختیار کیا جاتا ہے، ایک گرامی نامہ میں جس پر دیوبند کے ڈاکخانہ کی ۱۷ر جنوری ۱۹۱۲ء کی مہر ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''عزیز مکرم! بارک اللہ فیکم وسلم، سلام مسنون کے بعد التماس ہے کہ خط کاشفِ احوال ہوا تھا پھر کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی، کیا عرض کروں، کاہلی، ضعف، عدیم الفرصتی اس پر ارذل عمر کی آمد آمد، بس اللہ خاتمہ بخیر فرمادے۔''

الحمد للہ آپ اپنے اسباق میں مشغول ہیں خدا کرے جلد فراغت پاؤ اور اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں کو استقلال کے ساتھ انجام دو، والد ماجد خدا کرے تندرست ہوں، میرا اسلام مسنون عرض کر دینا۔''

ایک دوسرے گرامی نامہ میں جس پر ۱۳ر مئی ۱۹۱۲ء کی دیوبند کی مہر ہے، سید محمد صابر مرحوم کی تعزیت کے بعد جن کا چند ہی روز پہلے انتقال ہوا تھا تحریر فرماتے ہیں:

''معلوم نہیں مطب سے آپ کو فراغت کب تک ہو جائے گی؟ ہر آدمی کو جو وقت کام کرنے کا میسر ہو غنیمت ہے۔ واللہ یعلم ما سیہ غداً۔''

ڈاکٹر صاحب نے دیوبند میں ایک سال قیام کیا، بخاری و ترمذی مولانا محمود حسن صاحب سے پڑھی اور ابوداؤد مولانا انور شاہ صاحب سے، ڈاکٹر صاحب عربی میں درس کی تقریریں لکھتے تھے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے استعداد قوی اور فہم سلیم عطا فرمایا تھا اسلئے درس کی تحقیقات و مطالب بہت خوبی سے منضبط ہوئے، ان تقریروں پر مولانا انور شاہ صاحب کی نظر بھی پڑی ہے اور انہوں نے ان کو پسند کیا اور کہیں کہیں اپنے قلم سے تصحیح و اضافہ بھی فرمایا، کچھ حصہ کسی خاص وجہ سے انکے رفیق درس خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی (سابق ناظم دینیات جامعیہ ملیہ اسلامیہ) کے قلم سے ہے(۱)، ڈاکٹر صاحب

(۱) افسوس ہے کہ یہ مجموعہ میری غفلت سے تلف ہوگیا، کسی صاحب نے مطالعہ کے لئے لیا پھر واپس نہ کیا، بھائی صاحب مرحوم کو اس کا بہت افسوس رہتا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

باقاعدہ سالانہ امتحان میں شریک ہوئے اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے اور ان کو دارالعلوم کی باقاعدہ سند ۱۳۳۱ھ میں دی گئی، انہوں نے اپنی عادت کے مطابق امتحان کے پرچے محفوظ رکھے جواب بھی خاندان میں خطوط کے مرقعے میں لگے ہوئے ہیں، دستار بندی اور سند لینے کی نوبت نہیں آئی، ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) دیوبند کا آخری جلسۂ دستار بندی ہوا تھا اس کے بعد کوئی جلسہ نہیں ہوا، جب عرصہ کے بعد جلسہ دستار بندی کی تجویز مجلس شوریٰ نے منظور کی اور ان فضلائے دیوبند کی فہرست تیار ہونے لگی جن کی دستار بندی کی نوبت نہیں آئی تھی تو اس میں ان کا نام بھی تھا۔(۱)

۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ واپس ہوئے، طب خاندانی علم تھا، دادا اور والد دونوں کامل طبیب تھے بلکہ دادا صاحب کے مورث و مربی مولانا سید محمد ظاہر صاحب بھی طب میں دستگاہ رکھتے تھے، اس طرح یہ فن اس شاخ میں کم سے کم تین پشتوں سے چلا آرہا تھا، یوں بھی طب اس زمانہ میں ایک باعزت اور آزاد ذریعہ معاش سمجھا جاتا تھا اور دینداری کے لوازم اور علمی مناسبت بھی اس کے ساتھ نبھ جاتی تھی، ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ہمیشہ سے ہر قسم کی ملازمت بالخصوص سرکاری ملازمت سے متنفر تھی، اسلئے آپ نے فن طب کے حصول کیطرف توجہ کی، یہ دولت گھر ہی میں موجود تھی چنانچہ اپنے والد ماجد سے طب کی تمام متداول کتابیں پڑھیں اور انہیں کے مطب میں نسخہ نویسی شروع کی۔

حاذق الملک حکیم اجمل خان کی خدمت میں

اس وقت حاذق الملک حکیم اجمل خاں کی حذاقت و مہارت فن کی ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی، ہم مذاقی اور ندوۃ العلماء کے ساتھ دلچسپی کے رشتہ سے دونوں باکمال بزرگوں (مولانا حکیم سید عبدالحی اور حکیم اجمل خاں) کو ایک دوسرے سے ربط و

(۱) یہ جلسہ بعض مصالح اور موانع کی وجہ سے ۵۸ھ میں ملتوی کر دیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

تعلق تھا، جس طرح مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے اس خیال سے کہ صحیح تکمیل و تربیت باہر رہ کر ہوتی ہے اور ہر فن کو اس کے باکمال اساتذہ سے حاصل کرنا چاہیئے، ان کو حدیث کی تکمیل کیلئے دیوبند بھیجا تھا، طب میں وسعتِ نظر اور مزید تجربہ حاصل کرنے کے لئے ان کو حکیم اجمل خان صاحب کے پاس دہلی بھیجا، ساتھ ہی ساتھ یہ ہدایت کی کہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری سے بھی (جو حکیم صاحب کے مخلص دوست اور سیاسی خیالات میں ہم مسلک تھے) طب جدید کی بھی معلومات حاصل کریں۔

ڈاکٹر صاحب کا قیام چھ مہینے حکیم صاحب کے پاس رہا، حکیم صاحب جب مریضوں کو دیکھنے جاتے تو اکثر ان کو بھی ساتھ لے جاتے، اپنے خصوصی تجربات اور تحقیقات سے مستفید کرتے رہتے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی سلامت روی اور انقیاد اور محنت سے حکیم صاحب کے مزاج میں درخور حاصل کرلیا اور اتنا اعتماد پیدا کرلیا کہ حکیم صاحب ان کو اپنے ان منصوبوں میں شریک و معتمد بنانا چاہتے تھے جو طب قدیم کی احیاء وحفاظت کے لئے ان کے پیش نظر تھے جیسا کہ ان کے ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے بعد میں ان کے نام لکھے، مطب کے علاوہ دواسازی اور جدید تحقیقات کی طرف بھی انہوں نے توجہ کی اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

انگریزی تعلیم کی ابتدا

جب وہ دیوبند و دہلی سے فارغ ہو کر لکھنؤ آئے تو ان کو انگریزی تعلیم کے حصول کا شوق پیدا ہوا، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۱، ۲۲ سال کی تھی، ان کی شادی بھی ہوگئی تھی (۱) اور جب کہ اس کا پورا موقع تھا کہ آپ اپنی گزشتہ تعلیم سے، جس میں پوری محنت اور بلند ہمتی سے کام لیا تھا اور اس میں کامل استعداد بہم پہنچائی تھی، فائدہ اٹھائیں

(۱) آپ کی شادی اپنے حقیقی ماموں سید ابوالقاسم صاحب ہسوی کی صاحبزادی سے ۳۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو ہوئی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اور کوئی تدریسی مشغلہ اختیار کریں یا مطب شروع کریں، آپ کا از سرِ نو تعلیم جدید کے ایک طویل وعریض میدان میں جس کے لئے عمر کا ابتدائی حصہ زیادہ موزوں ہوتا ہے، مردانہ وار قدم رکھنا اور علوم عربیہ کا فاضل، ندوہ اور دیوبند کا فارغ اور طب کا عالم ہونے کے بعد انگریزی کی ابجد سے تعلیم کا آغاز کرنا، ایک بڑا دلیرانہ اقدام اور بڑی مردانگی کا کام تھا، آپ نے نہایت خاموشی کے ساتھ انگریزی کی ابتدائی کتابیں بعض انگریزی دانوں سے پڑھ لی تھیں اور اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ انگریزی اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ ہوسکے، والد ماجد کو بھی ان کی انگریزی تعلیم کا علم اس وقت ہوا جب انہوں نے اسکول داخلہ کی اجازت طلب کی اور انہوں نے اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا کہ انہوں نے انگریزی کب اور کس سے پڑھی تھی، اجازت ملنے پر آپ نے سنٹی نیل اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ کرایا جو مکان کے قریب ہی تھا اور جس میں مشنری اسکول ہونے کی وجہ سے یورپین اور عیسائی ٹیچر نمایاں تھے۔(۱)

آپ اسکول میں داخل ہوگئے اور تعلیم شروع ہوگئی، لیکن آپ نے اپنی وضع، لباس اور معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے دیا اور یہی حال میڈیکل کالج کی آخری تعلیم تک رہا، پاؤں میں دلی کا سلیم شاہی جوتا، بدن پر گاڑھے کا شرعی کرتا اور پائجامہ، سر پر دوپلی یا کشتی نما ٹوپی، گاڑھے کی اچکن، منہ پر پوری شرعی ڈاڑھی، نمازوں کی پابندی، اس وضعداری اور متانت کی وجہ سے اساتذہ بھی آپ کا لحاظ اور طلبہ بھی احترام کرتے۔

آپ نے اس اسکول سے نمایاں کامیابی کیساتھ میٹریکولیشن کا امتحان ۱۹۱۵ء میں پاس کیا، جس کے انعام میں آپ کو متعدد قیمتی انگریزی کتابیں ملیں، انٹرنیس کرنے کے بعد آپ لکھنؤ کے مشہور کرسچین کالج میں داخل ہوگئے، وہاں آپ نے بجائے ان

(۱) ان کے اسکول میں داخلہ کرانے کا واقعہ خان بہادر مولوی رکن الدین خان صاحب پرتاپ گڈھی نے مجھ سے خود بیان کیا، جو ان کو ساتھ لے کر گئے تھے، خان بہادر صاحب ضلع میں فوجداری کے نامور وکیلوں میں ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

مضامین (مثلاً عربی، فارسی، اردو، تاریخ) کے جو آپ کیلئے بہت سہل تھے، آپ نے انگلش لٹریچر بیالوجی (علم الحیات) فزکس (طبیعات) اور کیمسٹری (علم الکیمیا) اختیار کیا، ۱۳۳۵ھ ۱۹۱۷ء میں انٹرمیجیٹ پاس کیا۔

بی، ایس، سی میں امتیاز کے ساتھ کامیابی

ایف، ایس، سی کے بعد آپ اسی سال کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور بی، ایس، سی کے دو سال وہاں مکمل کر کے ۱۹۱۹ء (۱۳۳۷ھ) میں بی، ایس، سی کا فائنل امتحان اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ پورے کیننگ کالج میں آپ اول اور پوری الہ آباد یونیورسٹی میں، جس سے یہ کالج ملحق تھا، آپ کی دوسری پوزیشن آئی، بی، ایس، سی میں آپ کا خاص مضمون باٹنی (علم النبات) تھا، ۱۹۱۹ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں آپ کو دو امتیازی تمغے ملے، جن میں سے ایک طلائی تمغہ تھا اور اس وقت کے گورنر صوبہ جات متحدہ نے سند عطا کی، اس زمانہ میں کیننگ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کیمرن تھے جن کا شمار فلسفۂ جدید کے نامور فضلاء میں تھا، انہوں نے ذاتی طور پر اپنی خوشنودی اور اعترافِ قابلیت کا سرٹیفکٹ دیا، جو ابھی تک محفوظ ہے۔

والد ماجد کے نام ایک تاریخی خط

بی، ایس، سی کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد ان کے سامنے یہ سنجیدہ اور عملی سوال تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کا کیا نقشہ بنائیں اور حصولِ معاش کے لئے کون سا مشغلہ اختیار کریں، جس سے وہ اپنی سابقہ دینی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکیں اور زندگی کے حقیقی مقاصد کی تکمیل بھی کر سکیں، اس موقعہ پر انہوں نے اپنے والد ماجد مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

سید عبدالحی صاحب کے نام ایک مفصل خط تحریر کیا جس میں ان کے ذہن کی پختگی، دین کا عمیق فہم اور فطری حقیقت پسندی بہت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے، یہ خط نہ صرف اس کا مستحق ہے کہ ان کی سوانح میں شامل کیا جائے بلکہ اس قابل بھی ہے کہ ہمارے نوجوان فضلاء اور جو لوگ اس مسئلہ سے دوچار ہوں، اس کو پورے غور وفکر سے پڑھیں اور اس سے رہنمائی حاصل کریں۔

سلام وآداب اور اس سفر کی ضروری سرگزشت سنانے کے بعد جو بعض ماہرین فن سے ملنے کے لئے اختیار کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

''اپنی آئندہ طرز ماند وبود کے متعلق چار پانچ برس سے غور کر رہا ہوں اور اصولاً میں وہی سمجھتا ہوں جو جناب ارشاد فرماتے ہیں یعنی مقصدِ زندگی، حیات اخروی ہے اور دنیا مزرعۂ آخرت ہے، اگر دنیا سے مقصود آخرت ہو تو حصول دنیا کے لئے کوشش بھی باعث ثواب ہے، اس حیثیت سے معاملات بھی عبادات بن جاتے ہیں، پھر بھی دونوں میں وہی فرق ہے جو زمین وآسمان میں ہے، ایک مقصود ہے اور دوسرا مقصود کا آلہ، اگر منطقی دلائل سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو عرفان الٰہی وحیات دنیاوی تک جو کچھ نسبت ہے وہ قلب سلیم سے کسی وقت مخفی نہیں۔

صرف ہمیشیاں ہو وہ حصۂ عمر
جو تیری یاد میں بسر نہ ہوا

عرفان الٰہی کے بعد ایک انسان کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ اپنے اوقات خدائے عز وجل کی رضا جوئی میں صرف کرے اور حقیقت میں یہ عرفان کامل کے لئے ایک امر لازم ہے، طلب معاش اس حیثیت سے ضروری رہے گی جس حد تک یہ رضا جوئی کے لئے کارآمد ہو، اس کے بعد اگر رضا جوئی میں مخل نہ ہو تو مباح ہوگی اور اگر اوقات عزیز

www.abulhasanalinadwi.org

کوضائع کرے تو حرام ہوگی۔

رضا جوئی کے لئے جن اعمال کی ضرورت ہے، ان میں بھی فرق مراتب ہے، سب سے مقدم وہ اعمال ہیں جو محض ذکر الہیٰ وتزکیۂ باطن پر مشتمل ہیں، مثلاً صوم وصلوٰۃ وحج وتلاوت، اس کے بعد وہ اعمال ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ وہدایت خلق پر مشتمل ہیں، مثلاً جہاد واستعداد للحرب ووعظ وتذکیر، اس کے بعد وہ اعمال ہیں جو عامہ مسلمین کے منافع دنیاوی پر مبنی ہیں، مثلاً زکوٰۃ وصدقات وصلہ رحمی وتعلیم، میرے خیال میں ہر مسلمان کو اپنی زندگی میں اس فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہئے، یہ ترتیب معتدل ومتوسط حالات کے لئے ہے، غیر معمولی حالات میں اس میں تغیر کرنا ہوگا، مثلاً جس وقت صنف دوم یا سوم کی عبادات زیادہ ضروری ہوجائیں تو صنف اول کی عبادات میں اتنا تغیر کرنا ہوگا کہ ان میں سے فرائض وسنن ادا کرنے کے بعد جو کچھ وقت بچے وہ صنف دوم وسوم میں صرف کیا جائے، لیکن صنف اول کا وہ حصہ جو صنف دوم وسوم کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، مثلاً ذکر قلب وتلاوت، وہ کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہئے، دوسرے یہ کہ کسی خاص صنف کے زیادہ ضروری ہونے کی حالت میں تمام اعمال میں خواہ وہ دنیاوی ہوں یا دینی اسے پیش نظر رکھنا چاہئے اور ان کا انتخاب اس طرح کرنا چاہئے کہ حتی الامکان تمام اعمال کم از کم ضمناً ہی اس صنف کی عبادات کے لئے معین ہوں۔

تذکیر وتعلیم ہمیشہ سے ضروری رہی ہے اور جتنا رسول اللہ ﷺ سے بُعد زمانی بڑھتا گیا ہے اسی قدر زیادہ ضروری ہوتی گئی ہے، لیکن یہ اصول کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہی تذکیر مفید ہوسکتی ہے جس کی جانب مخاطب کا نفس متوجہ کیا جاسکے، عوام بلکہ خواص کے نفوس بھی امور حاضرہ دنیاوی کی جانب آسانی سے متوجہ ہوجاتے ہیں کہ یہ تقاضائے فطرت ہے، اس لئے حکمت الہیٰ اس کی مقتضی ہوئی کہ اس امت کے لئے جس کو

www.abulhasanalinadwi.org

فحوائے ﴿کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر﴾ ہدایت کا کام سپرد کیا گیا تھا، غلبہ وتفوق فی الارض وعلو بھی لازم کر دیا گیا، نہ اس لئے کہ "اکراہ فی الدین" ہو بلکہ اس لئے کہ نفوس امم اس امت کی تقلید پر آمادہ ہو جائیں اور ان کی تذکیر پر توجہ کریں، کیونکہ اہل دنیا جن کے نزدیک دنیا ہی سب سے بڑی چیز ہے کسی کا دنیاوی غلبہ دیکھ کر اسے ہر امر میں اپنے سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں یہاں تک کہ اس کے مذہبی اور دینی تفوق پر بھی ایمان لے آتے ہیں انبیاء سابقین میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے سبا کے قاصدوں کو دکھانے کے لئے اپنی عظمت اسی لئے ظاہر کی تھی اور ملکۂ سبا کا تخت منگوالینا بھی اسی پر مبنی تھا نیز اسے صرح ممرد میں لے جانا بھی اسی غرض سے تھا کہ وہ اپنے آپ کو دینی حیثیت سے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے کمتر سمجھے اور جس طرح اس نے کانچ کو پانی سمجھنے میں غلطی کی اور اس غلطی کا احساس کیا اسی طرح آفتاب پرستی کی غلطی کا بھی احساس کر لے، چنانچہ اس غلطی کے احساس کے بعد ہی اسے اس غلطی کا بھی احساس ہو گیا اور وہ ایمان لے آئی، معجزات کا بہت بڑا فائدہ بھی یہی تھا کہ ان کی وجہ سے انبیاء کی عظمت نمایاں ہو جاتی تھی اور قوم کے نفوس ان کے کلام پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

اس زمانہ کے حالات دیکھتے ہوئے یہ اظہر من الشمس ہے کہ صنف دوم کی عبادات کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور ان میں بھی بحکم ﴿وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة﴾ استعداد کی اہمیت سب سے زائد ہے، اس وقت کے حالات اس کے مقتضی ہوئے ہیں کہ قتال کی فرضیت استعداد کی طرف منتقل ہو جائے، اس لئے مسلمانوں کے تمام اعمال میں یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیئے اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق اپنے تمام اعمال میں خواہ وہ معاش کیلئے ہوں، خواہ معاد کے لئے، اسکی اعانت کرتے رہنا چاہیئے۔

مطلق علم ایک صفت مستحسن ہے، اسی طرح تمام علوم طبع سلیم کو مرغوب ہیں، لیکن

www.abulhasanalinadwi.org

ان میں سے بعض عملی حیثیت سے انسان کی جسمانی و مادی ترقی کیلئے ضروری ہیں اور بعض روحانی ترقی اور تزکیۂ باطن کے لئے اور بعض تنشیط ذہن وتفریح طبع کے لئے، تحصیل علوم کے احکام نیت پر موقوف ہیں، لیکن جو عام تزکیۂ باطن کے لئے ضروری ہیں، مثلاً علوم قرآن وحدیث وسیرت، ان سے بہرحال شغل رکھنا ضروری ہے، جن حالات میں استعداد کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی انہیں حالات میں ان علوم کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی، جن پر استعداد موقوف ہے مثلاً کیمیا اور ریاضی وطبعیات والسنہ وتاریخ واقتصاد وصناعات وغیرہ استعداد فرض کفایہ ہے، اس لئے ان علوم کی تحصیل بھی فرض کفایہ ہوجائے گی اور جب تک ان علوم کے ماہروں کی تعداد کفایت کی حد تک نہ پہنچ جائے تمام افراد پر اس کا بار رہے گا، تیسری قسم کے علوم مثلاً ادب وشعر بھی بعض وقت مؤکد ہوجاتے ہیں اور بعض وقت مکروہ، جب باعث اضاعت وقت ہوجائیں تو مکروہ ہوجائیں گے اور جب ان سے فرائض ومؤکدات کے لئے ذہن کو تیار کرنے کا کام لیا جائے تو مؤکد ہوجائیں گے۔

میں اپنے لئے جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ انہیں اصول پر مبنی ہے، سب سے پہلے میں تزکیۂ نفس احسان کو ضروری سمجھتا ہوں، اس کے لئے میری یہ خواہش تھی کہ مولانا محمود حسن صاحب (۱) سے بیعت کروں اور حسب ضرورت ان کی خدمت میں رہوں، اب میں ان کی واپسی کا منتظر ہوں لیکن معلوم نہیں کہ کل کیا ہو، اس لئے اس کے متعلق میں جناب سے مشورہ چاہتا ہوں، میری ذاتی خواہش ان کے بعد مولانا محمد علی صاحب (۲) سے ہے، لیکن مولانا محمود حسن صاحب کے علاوہ اور کسی بزرگ سے میں اسی وقت بیعت کروں گا جب کچھ روز صحبت میں رہ کر مجھے اطمینان قلب حاصل ہوجائے۔

معاش کے لئے فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے اس کا لحاظ رکھنا چاہئیے کہ تحصیل

(۱) شیخ الہندؒ جو استاد بھی تھے، اس وقت مالٹا میں اسیر تھے۔ (۲) حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء۔

www.abulhasanalinadwi.org

معاش میں کم وقت صرف ہو اور حتی الامکان شدید دماغی محنت نہ برداشت کرنی پڑے تاکہ میں اپنا دماغ اس سے بہتر کاموں میں لگا سکوں اور بہتر تو یہ ہے کہ کسی خاص مقام یا شخص یا حکومت کا مجھے پابند نہ ہونا پڑے، ڈاکٹری میں حسب ذیل وجوہ سے پسند نہیں کرتا (۱) اگر برابر پاس ہوتا جاؤں تو پانچ برس مجھے ابتداء کے لئے چاہئیں۔ (۲) بہترین قوائے دماغی اسکی تحصیل میں ضائع ہو جائیں گے (۳) مطب کی کامیابی کی صورت میں اگر ایمانداری سے کام کروں تو نہ وقت بچے گا نہ دماغ، جناب نے محکمۂ تعلیم کی ملازمت کی جانب اشارہ فرمایا ہے لیکن ٹریننگ کالج کی مدت تعلیم چھ مہینے نہیں بلکہ دو سال ہے اس کے بعد بھی پروفیسری کی اہلیت نہیں پیدا ہو سکتی وہ تو ایم، ایس، سی پاس کرنے کے بعد صرف کثرت مطالعہ پر موقوف ہے، اگر محض خدمت علم مدنظر ہوتی تو میں اپنی عمر اس میں صرف کرتا اور مجھے امید تھی کہ نئے نتائج حاصل کرتا مگر مقصود دین ہے، اس لئے اس علم پر جو دین کا وسیلہ نہ ہو، قناعت نہیں کی جا سکتی، اگر ٹریننگ کالج میں ایل، ٹی پاس کروں تو ہیڈ ماسٹر ہو سکتا ہوں لیکن یہاں بھی مجھے مدرسہ کے علاوہ وقت صرف کرنا ہوگا، اس کے علاوہ دنیاوی حیثیت سے بھی یہ دونوں جگہیں زیادہ مفید نہیں یعنی اس صوبہ میں دو گورنمنٹ کالج ہیں ایک الہ آباد میں دوسرا بنارس میں اور وہاں مجھے پروفیسری کی کوئی امید نہیں، اس لئے وہاں انگریز ہی پروفیسر ہوتے ہیں یا ایسے ہندوستانی جو جرمنی وغیرہ کے تعلیم یافتہ ہوں، اسلئے مجھے اسسٹنٹ پروفیسری کی امید ہو سکتی تھی مگر دستور یہ ہے کہ حتی الامکان وہ انگریز پروفیسر اپنے شاگردوں ہی کا انتخاب کیا کرتے ہیں اور کالجوں یا اسکولوں میں ملازمت کروں تو تھوڑی تنخواہ پر بہترین وقت وعمر، دماغ صرف کرنے کے بعد بھی پنشن نہیں مل سکتی، محکمۂ تعلیم کے علاوہ اور کسی صیغہ میں مستقل طور پر ملازمت کرنے پر طبیعت راغب نہیں ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

میرے خیال میں تیسری صورت سب سے بہتر ہے، یعنی میں مطب کروں لیکن اسی پر اقتصار کر لینا بہتر نہیں معلوم ہوتا، خدائے تعالیٰ سے بہر حال امیدیں ہیں لیکن توکّل فعل قلب ہے نہ کہ فعل جوارح، اگر تزکیۂ باطن سے توکّل حاصل ہو جائے تو اور پیشے اس میں مضر نہیں ہو سکتے، اگر نہ حاصل ہو تو اور اعمال کے ترک سے توکل پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے میں مطب کے ساتھ ہی دوسرا شغل بھی رکھنا چاہتا ہوں، یعنی ہندوستانی دواخانہ کے طرز کی دوکان اور انگریزی دواسازی، یا صابن سازی کا کارخانہ، اس میں غالباً جناب خیال فرمائیں کہ وقت زیادہ صرف ہوگا، لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے، اگر صحیح طریقہ پر کام کیا جائے تو محض نگرانی سے سب کام چل سکتے ہیں، ابتداء میں جس وقت کام چھوٹے پیمانہ پر ہوگا تو مجھے بہ حیثیت صنّاع کیمیائی کے بعض جزئیات کی براہ راست نگرانی کرنی ہوگی، اس کے بعد جب میں معمولی درجہ کے کیمیادانوں کو مقرر کر سکوں گا تو میں مشیر کیمیائی کی حیثیت سے ان کے کام پر نظر رکھوں گا اور محض تجارتی نگرانی ضروری ہوگی، عملی تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔،،

اس کے بعد انہوں نے سر جے۔ پی۔ سریواستوا (۱) کے مشورہ سے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ اول بنگلور کے سائنس انسٹیٹوٹ میں تربیت حاصل کریں پھر دواسازی کا کارخانہ قائم کریں جس میں بہت سے سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

مڈیکل کالج میں داخلہ

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض دشواریوں کے پیش نظر یا مزید غور و فکر کے نتیجہ اور والد صاحب کے ایماء پر طب جدید (میڈیسن) کے حصول و تکمیل کا فیصلہ کیا اور ۱۳۳۸ھ

(۱) جو بعد میں یو پی کے وزیر بھی ہو گئے تھے، انہیں کے اہتمام میں لکھنؤ کی مشہور نمائش ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

۱۹۲۰ء میں آپ کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ کے باقاعدہ طالبعلم بن گئے اور تعلیم شروع کردی، اسی زمانہ میں آپ نے ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء میں ایک عرصہ تک تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں آنریری پروفیسر کی حیثیت سے تدریس کی خدمت انجام دی۔ (۱)

اس وقت میڈیکل کالج کا پرنسپل التزاماً انگریز ہوتا تھا اور اسٹاف میں بھی بڑی تعداد میں انگریز اساتذہ ہوتے تھے کالج کا ماحول بھی (اس وجہ سے کہ بالعموم آسودہ حال خاندانوں کے نہایت ذہین اور لائق نوجوان اس میں داخل ہوتے تھے) بہت مغربی، ترقی یافتہ اور غیر اسلامی تھا، ادھر لباس ووضع اور فرائض مذہبی کی وہی پابندیاں تھیں، جن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے، یہاں کے اس نامانوس اور قدامت دشمن ماحول کے باوجود آپ کی ان خصوصیات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا، نہ داڑھی اونچی ہوئی، نہ پائچے نیچے، نہ قمیض نے کرتہ کی جگہ لی، نہ نمازوں کے اہتمام میں فرق آیا، سب سے مشکل مرحلہ سالانہ امتحان کا تھا جس میں کئی کئی گھنٹے امتحان ہال سے نہ نکلنے اور کوئی دوسرا کام نہ کرسکنے کی پابندی تھی، بھائی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ دورانِ امتحان نماز کا وقت آیا، (خاص طور پر جب پریکٹیکل ہونا تھا) تو میں نے وہیں شیروانی بچھا کر نماز شروع کردی، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ہمارے ممتحن یا نگراں نے بڑی معذرت کی اور کہا کہ مسٹر حسنی (اسی نام سے وہ وہاں یاد کئے جاتے تھے) اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ تمہاری عبادت کا وقت ہے تو ہم چٹائی یا فرش کا انتظام کردیتے اور یہ کہہ کر معافی مانگی۔

کالج کا انگریز پرنسپل ڈاکٹر صاحب کی محنت، اصابت رائے اور فن سے مناسبت کا بڑا قائل ہوگیا تھا، غالباً یہ بات ان کو اس لئے بھی حاصل تھی کہ وہ یونانی طب سے فارغ ہوچکے تھے اور مرض کی تشخیص میں قدرتی طور پر اس سے مدد ملتی تھی، فرماتے تھے کہ بعض

(۱) تصدیق نامہ شفاء الملک حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم آنریری سکریٹری تکمیل الطب کالج مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۲۷ء۔

www.abulhasanalinadwi.org

مرتبہ پرنسپل کی طبیعت مضمحل ہوتی یا اور کوئی سخت مصروفیت ہوتی اور کوئی مریض کو دکھانے کے لئے لے جانا چاہتا تو اپنے بجائے مجھے بھیج دیتا۔

والد ماجد کی وفات

ابھی آپ کی تعلیم کا تیسرا یا چوتھا سال تھا اور میڈیکل کالج کے طلبہ کی ایک پارٹی کے ساتھ کالج کی طرف سے زنانہ امراض کے مطالعہ کے لئے مدراس میڈیکل کالج گئے ہوئے تھے اور وہاں سے فارغ ہوکر (اپنے موروثی تاریخی ذوق کی بناء پر) حیدرآباد، گولکنڈہ، اورنگ آباد اور ان کے تاریخی مقامات کو دیکھتے ہوئے واپس ہو رہے تھے کہ بمبئی میں اچانک آپ کو والد ماجد کی وفات کی صاعقہ اثر خبر ملی اور آپ لکھنؤ واپس ہوئے جہاں اس وقت کچھ نہ تھا اور جس کو زندہ سلامت اور باہزاراں شفقت ومحبت چھوڑ کر گئے تھے وہ رائے بریلی کی خاک میں محو استراحت تھا، اس واپسی اور اس کے تأثرات وکیفیات کی تفصیل (حیات عبدالحی) کے باب ہفتم میں گزر چکی ہے۔

والد ماجد نے کوئی جائداد اور کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا، اب بڑا مسئلہ پسماندگان کی کفالت (جن کی ذمہ داری اچانک ان کے سر آگئی تھی) اور کثیر المصارف طبی تعلیم کی تکمیل کا تھا، میڈیکل کالج کی فیس اور کورس کی کتابوں کی قیمتیں بالعموم دوسرے کالجوں سے زیادہ ہوتی ہیں، یہاں عالم یہ تھا کہ جائداد قسم کی کوئی چیز نہ تھی، روز کا روز کنواں کھودنا اور پانی پینا، والد ماجد کا طرزِ زندگی تھا، اس وقت والد صاحب کے متعدد دوستوں کے خطوط ہمدردی وہمت افزائی کے آئے، لیکن ان کی غیور طبیعت نے کسی کو تکلیف دینا گوارہ نہ کیا، اپنے ایک ہندو اور ایک شیعہ پروفیسر کا ذکر وہ بڑی ممنونیت سے کرتے تھے، جنھوں نے عملی پیش کش کی اور نہایت شریفانہ وبزرگانہ معاملہ کیا۔(۱)

(۱) افسوس ہے کہ راقم کو ان کا نام یاد نہ رہا۔

www.abulhasanalinadwi.org

نواب نورالحسن خان مرحوم کے خاندان کی ہمدردی وعنایت

اس وقت جبکہ ان کے لئے لکھنؤ میں ٹھہرنے کا بھی کوئی ٹھکانا اور کھانے کا بھی کوئی بندوبست نہ تھا، والد ماجد ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے اور وہ چھوڑ دیا گیا تھا، والد ماجد کے جگری دوست محب باوفا نواب سید نورالحسن خاں (فرزند اکبر والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر) کی بیگم صاحبہ (۱) نے عزیزوں اور بزرگوں سے بڑھ کر غم گساری کا ثبوت دیا، بلکہ مادرانہ شفقت ومربیانہ الطاف کا مظاہرہ کیا اور بھائی صاحب کو اپنے یہاں ٹھہرا کر اپنے معزز کنبہ کا ایک فرد بنالیا اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں اور اپنی عزیز اولاد میں کوئی فرق نہیں رکھا، یکسوئی اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لئے اپنی عالیشان کوٹھی ''بھوپال ہاؤس'' واقع گھسیاری منڈی کا ایک حصہ، جو کوٹھی سے علاحدہ بھی تھا، حوالہ کردیا، جہاں وہ عزیز کتب خانہ بھی منتقل ہوگیا، جو بازار جھاؤلال کے مکان میں ابھی تک امانت تھا اور تا اختتام تعلیم ان کو اپنا مستقل مہمان بلکہ فرد خاندان بنالیا، راقم الحروف کو اس زمانہ میں بھائی صاحب کے ساتھ مسلسل اور طویل قیام کرنے کا موقع ملا، بیگم صاحبہ مرحومہ کی شفقتوں اور ان کے گرامی قدر صاحبزادوں (نواب سید ظہورالحسن خاں اور نواب سید نجم الحسن خاں) کی برادرانہ نوازشوں کی یاد ابھی تک دل پر نقش ہے، اور اس کی نظیر اس زمانہ کی بے ثبات دوستیوں اور سطحی تعلقات کے عہد میں نہیں مل سکتی۔

نواب نورالحسن خاں مرحوم کے خاندان کے علاوہ ہمدردی وبزرگانہ شفقت کی دوسری مثال والد ماجد کے دوسرے مخلص دوست منشی رحمت اللہ صاحب مرحوم کی تھی، بعض زمانوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت میڈیکل کالج کی مصروفیت ہی میں آجاتا تھا، منشی صاحبؒ جاڑوں کے موسم میں اگر کھانا بھیجتے تو اس کو گرم رکھنے کے لئے آگ بھی،

(۱) نواب صاحب کا انتقال ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں ہو چکا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

کھانا بھی نہایت اہتمام کے ساتھ بھیجتے، ڈاکٹر صاحب نے اکثر بڑے تشکر کے جذبہ سے ساتھ ان کی اس عنایت کا ذکر کیا۔

میڈیکل کالج سے فراغت اور مطب کا آغاز

ڈاکٹر صاحب نے ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں میڈیکل کالج کے آخری سال کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے، اور ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ نومبر ۱۹۲۵ء میں انہیں سند ملی اس سے پہلے وہ تمام مضامین میں کامیاب ہو چکے تھے، لیکن امراضِ چشم میں وہ چند نمبروں سے ناکام رہے تھے اس لئے ان کو کچھ مدت کے بعد اس کا ضمنی امتحان دینا پڑا تھا، بہر حال اب وہ مکمل طریقہ پر میڈیکل کالج کی تعلیم سے فارغ اور باقاعدہ ڈاکٹر بن چکے تھے، انہوں نے غالباً رجب ۱۳۴۴ھ جنوری ۱۹۲۶ء سے گوئن روڈ لکھنؤ پر والد صاحب کے قدیم مطب کے قریب (جس میں کچھ عرصہ کے بعد انکو پھر منتقل ہونا تھا اور بقیہ زندگی گزارنی تھی) مطب کا آغاز کر دیا اور قریب ہی بازار جھاؤلال میں کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگے، آپ کا مطب طب قدیم وجدید (یونانی وڈاکٹری) کا جامع تھا اور یہ خصوصیت کم سے کم لکھنؤ میں اس پیمانہ پر آپ ہی کو حاصل تھی کہ آپ دونوں کے باقاعدہ فاضل اور دونوں طریقۂ علاج کے مستند طریقہ پر جامع تھے۔

مطب کا آغاز ہوا تو آپ نے اپنے والد ماجد کے مخلص دوستوں کو اس کی اطلاع دی اور انہوں نے اس پر اپنی مسرت واطمینان کا اظہار کیا، یہاں پر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا ایک خط نقل کیا جاتا ہے (جو ان کے معروف طرز تحریر کا نمونہ اور ان کے قلبی مسرت کا آئینہ دار ہے۔)

"میاں عبدالعلی! سلامت رہو، باکرامت رہو۔

www.abulhasanalinadwi.org

خط پہنچا، آپ کی ہر کامیابی کی خبر دلنواز ہے اور مسرت افزا۔ مطب شروع ہوگیا، مخلصین کی آرزو برآئی، حذاقت وشفا کا شہرہ ثمرہ مزید آرزو برلائے" وما ذلک علی اللہ بعزیز."

اس خط پر ۱۵ر فروری ۱۹۲۶ء(۱) کی تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطب آخر جنوری میں شروع ہوا ہے۔

عرصہ تک آپ ڈاکٹری ویونانی علاج کرتے رہے، ڈاکٹری زیادہ یونانی کم، لیکن غالباً ۳۰ء کے بعد آپ نے ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کا مطالعہ کیا اور بہت سے امور میں اس کے اصول اور اس کی نافعیت کے قائل ہوگئے، اس لئے زندگی کے اخیر برسوں میں بہت سے امراض میں آپ ہومیو پیتھک کو ترجیح دینے لگے جس سے آپ کے مطب اور آمدنی کو خاصا نقصان پہنچا، اسلئے کہ لوگ آپ کے پاس ایک مستند ڈاکٹر یا ایک حاذق یونانی حکیم سمجھ کر آتے تھے، ہومیو پیتھک کے لئے شہر میں بہت سے نامور ڈاکٹر تھے، لیکن آپ اسکی مطلق پروانہیں کرتے تھے اور جس مریض کے لئے جو مفید سمجھتے تھے وہی تجویز کرتے تھے۔

نبّاضی و تشخیصِ امراض آپ کو والد صاحب سے ورثہ میں ملی تھی، اس لئے آپ کی تشخیص اکثر بے خطا ہوتی تھی اور اس کی مدد سے آپ نے بڑے معرکہ کے علاج کئے جن کے قصّے آپ کے پرانے مریض سناتے ہیں۔

بیعت وحج

جیسا کہ اس خط سے معلوم ہو چکا ہے جو آپ نے اپنے والد ماجد کے نام لکھا

---

(۱) ۳۰ر رجب ۱۳۴۴ھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

تھا، آپ کا ارادہ تھا کہ آپ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی سے بیعت وتربیت کا تعلق قائم کریں، شیخ الہند مالٹا سے رمضان ۱۳۳۸ھ (اپریل ۱۹۲۰ء) میں ہندوستان تشریف لائے تو بیحد مصروف اور زیادہ تر علیل رہے اور صرف چھ مہینے ہندوستان میں گزار کر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ ۳ نومبر ۱۹۲۰ء کو اس دار فانی کو خیر باد کہا، غالباً آپ کو اس وجہ سے اس کا موقع نہ مل سکا اور آپ نے ان کے حقیقی جانشین مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ سے یہ تعلق قائم کرلیا اور جانبین کو ایک دوسرے سے اتنی مناسبت اور قلبی ارتباط قائم ہوگیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ڈاکٹر صاحب کا گھر لکھنؤ میں مولانا مدنی کی مستقل فرودگاہ بن گئی اور اس معمول و وضعداری میں سخت سے سخت حالات میں بھی کبھی فرق نہیں آیا، ڈاکٹر صاحب کو بھی حضرت مدنیؒ سے ایسی عقیدت اور ایسا مخلصانہ تعلق تھا جس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے اور اس کا اندازہ انہیں لوگوں کو ہے جنہوں نے مولانا کے لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں مولانا کی مسرت وانبساط اور ڈاکٹر صاحب کے صدق واخلاص کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں کہ مطب شروع کئے ہوئے ابھی چھ ہی سات مہینے ہوئے تھے، ان کو حج کا شدید وقوی داعیہ پیدا ہوا، راقم سطور کو یاد ہے کہ اس کے استاد شیخ خلیل بن محمد عرب جوان کے رفیق سفر بننے والے تھے، دیر تک دونوں دوستوں میں جذب وشوق کی باتیں اور اس سفر کے مشورے ہوتے رہتے، بالآخر وہ سفر حج کے لئے روانہ ہوگئے، یہ وہ سال تھا جب سلطان ابن سعود نے مؤتمر اسلامی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کی دعوت ممالک اسلامیہ کے مسلم زعماء اور قائدین کو دی تھی، ہندوستان سے ''جمعیۃ العلماء'' کا وفد مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی قیادت میں اور ''خلافت'' کا وفد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی قیادت میں روانہ ہوا، اسی سال مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے ان وفود

www.abulhasanalinadwi.org

کے سلسلہ میں اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبد الواحد غزنویؒ اور علماء وفضلاء کی ایک بڑی جماعت نے حج وزیارت کی سعادت حاصل کی، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ اور بہت سے دوسرے مشاہیر اور زعملااس سال مؤتمر کی شرکت کے لئے ہندوستان سے گئے تھے اور حج کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے، اس سفر میں ڈاکٹر صاحب کے تین عزیز سید زبیر صاحب حسنیؒ، سید محمد عمر صاحبؒ انجینئر اور مولانا سید طلحہ صاحبؒ ایم۔اے (اور یہ تینوں حقیقی بھائی تھے) بھی شریک اور ہم سفر تھے۔

یہ حکومت سعودیہ کے قیام کا ابتدائی زمانہ تھا، امن قائم ہوگیا تھا، لیکن انتظامات بالکل ابتدائی تھے، حجاج کے قافلے اونٹوں ہی سے سفر کرتے تھے چنانچہ مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کا سفر ۱۳ردن میں تمام ہوا، مؤتمر میں شرکت کے لئے مصر وشام کے بڑے بڑے فضلاء وزعماء آئے تھے، جن میں علامہ سید رشید رضا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ڈاکٹر صاحب کی ان میں سے بہت سے سربرآوردہ اصحاب سے ملاقات ہوئی، وہ سلطان سے بھی ملے، اس ملاقات میں ان کے عزیز سید محمد عمر صاحب (۱) حسنی بھی ساتھ تھے جو جرمنی سے ہندوستان واپس آرہے تھے اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے

---

(۱) سید محمد عمر حسنی خاندان قطبی حسنی کے، جس سے صاحب سوانح کا تعلق ہے، چشم وچراغ اور اس کے قابل فخر فرزندوں میں سے تھے، ۱۳۰۴ھ میں ولادت ہوئی، سائنس کی اعلیٰ تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں حاصل کی پھر جاپان چلے گئے، وہاں سے اعلیٰ ڈگریاں اور عملی تجربہ حاصل کر کے واپس آئے، کچھ عرصہ ریاست بھوپال سے متعلق رہے پھر جرمنی گئے اور وہاں بڑا امتیاز حاصل کیا، مختلف اکیڈمیوں کے اعزازی ممبر منتخب ہوئے۔ واپس آکر کچھ عرصہ اپنے وطن ٹونک پھر جوناگڈھ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، ۱۳۶۰ھ میں انتقال کیا، ان کی ذات، مکارم اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھی، بے نفسی، تواضع اور صلہ رحمی، ان کے نمایاں اوصاف تھے، ان کی تنخواہ اعزا کے حقوق اور غربا کی پرورش کے لئے گویا وقف تھی، لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق رکھتے تھے، کچھ عرصہ "الہلال" کلکتہ میں بھی کام کیا، "مشاہدات سائنس" ان کی واحد علمی یادگار ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حجاز حاضر ہوئے تھے، وہ سلطان کے نام امیر شکیب ارسلان کا تعارفی خط بھی لائے تھے، ان کے پاس سائنس وانجینیر نگ کی بڑی اعلیٰ ڈگریاں تھیں، اپنے اسلامی جذبہ اور خاندانی ونسبی تعلق کی بناء پر دونوں کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی صلاحیتیں اس نوزائیدہ اسلامی حکومت اور اس مقدس سرزمین کی خدمت کے لئے نذر کریں، انہوں نے سلطان کے سامنے یہ پیش کش بھی کی، سلطان بڑی بے تکلفی اور خصوصیت کے ساتھ ملے اور ان کی بڑی پذیرائی کی، لیکن مصری وشامی مشیروں کے اثر سے، جو اس وقت سلطان کے گردوپیش رہتے تھے، سلطان نے معذرت کی اور سردست اس کی کوئی صورت نہیں نکل سکی جس کا قلق ان دونوں کو بعد تک رہا۔

مدینہ طیبہ میں انہوں نے وہاں کے مشہور شیوخ حدیث محمد بن احمد العمری المغربی المالکی مدرس حرم نبوی اور محمود بن احمد الشہیر باہاشم الفونی التیجانی مہاجر سے حدیث کی سند واجازت حاصل کی، شیخ الاسلام کے مشہور کتب خانہ سے بھی استفادہ کیا، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس موقع پر موجود رہا کرتے تھے۔

ان کی واپسی ہوئی تو انہوں نے کسی کو، اس خیال سے کہ رسمی استقبال ان کے اس عمل کی قدر وقیمت کو نقصان نہ پہنچائے، اطلاع نہیں کی اور ہم لوگ رائے بریلی میں بیٹھے تھے کہ وہ اچانک وارد ہوگئے، اس سفر سے واپسی کے بعد وہ بدستور مطب میں مشغول ہوگئے ان کا مطب روزافزوں ترقی پر تھا، طب کی جامعیت، فن کی حذاقت اور پیشہ کی دیانت کی وجہ سے غیر معمولی کم گوئی بلکہ بے زبانی کے باوجود انکو مرجعیت حاصل ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ ۱۳۴۷ھ کے آخر اور ۱۹۲۹ء کے شروع میں وہ اس قدیم مکان میں منتقل ہوگئے، جہاں والد ماجد کی سکونت اور مطب تھا اور جہاں ان دونوں نے اپنی زندگی کے آخری سانس گزار کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

www.abulhasanalinadwi.org

ندوہ کی خدمت

والد ماجد کے انتقال کے بعد ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو وہ رکن انتظامی منتخب ہوئے، اس وقت جیسا کہ اوپر کے صفحات سے معلوم ہو چکا ہے، نواب سید علی حسن خان صاحب مرحوم ندوہ کے ناظم تھے، ۱۹ر ربیع الآخر ۱۳۴۷ھ ۶ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کے جلسہ میں انہوں نے بربنائے علالت وخرابی صحت نائب ناظم کے انتخاب کی خواہش ظاہر کی اور ڈاکٹر صاحب بالاتفاق نائب ناظم منتخب ہوئے، ۲۶ر ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء اور ۲۱ر محرم ۱۳۵۰ھ ۹ر جون ۱۹۳۱ء کے درمیانی عرصہ میں انہوں نے (نواب صاحب کی مسلسل علالت اور ضعف کی وجہ سے) قائم مقام ناظم کے فرائض انجام دیئے۔

۲۰ر محرم ۱۳۵۰ھ ۹ر جون ۱۹۳۱ء کے جلسہ انتظامی میں ضعف وعلالت کی بناء پر نواب صاحب کا عہدۂ نظامت سے استعفیٰ منظور ہوا، اس درخواست وتوقع کے ساتھ کہ جناب ممدوح کی ہمدردی وشفقت ندوۃ العلماء کے ساتھ اسی طرح قائم رہے گی جس طرح کہ عہد نظامت اور اس سے قبل تھی، دوسری تجویز کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب ۹ر جون ۱۹۳۱ء سے ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے جس میں توسیع اور مسلسل ان کے انتخاب کی تجدید ہوتی رہی، اور یہ ذمہ داری اور عہدہ انکی زندگی کے آخری وقت تک برقرار رہا، اس طرح ۱۳۵۰ھ تا ۱۳۸۱ھ، ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۱ء تک مسلسل تیس سال وہ ندوۃ العلماء کی نظامت کے منصب پر فائز رہے اور یہ طویل ترین مدت تھی جو اس وقت تک ندوۃ العلماء کی تاریخ میں کسی ناظم کو بحیثیت ناظم کے ندوۃ العلماء کی خدمت کے لئے میسر آئی۔

سیاسی حالات کی تبدیلی اور ملک میں مختلف تحریکات کی وجہ سے ان کے طویل دور نظامت میں ندوۃ العلماء کا کوئی سالانہ جلسہ نہیں ہوسکا جو اس کی روایت بن چکی تھی، لیکن اس ایک پہلو کو چھوڑ کر جو حالات کی تبدیلی کا نتیجہ تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ان کے عہد

www.abulhasanalinadwi.org

میں نمایاں ترقی کی اور بعض ایسی خوشگوار تبدیلیاں ان کے عہد میں رونما ہوئیں جن کی وجہ سے انکا دور ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ایک زرّیں عہد کہا جا سکتا ہے۔

ان کے دورِ نظامت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کو ارکان انتظامی اور فرزندانِ ندوہ کی بڑی سے بڑی تعداد کا اعتماد وتعاون حاصل تھا، اسی دور میں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مسعود علی صاحب مرحوم نے ندوہ کے کاموں اور دار العلوم کی ترقی سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینی شروع کی اور اپنی شخصیت کا پورا وزن اس کے پلڑے میں ڈال دیا، مولانا سید سلیمان ندوی شعبان ۱۳۶۹ھ مطابق مئی ۱۹۵۰ء تک (پاکستان منتقل ہونے کے وقت تک) معتمد تعلیم رہے، وہ طویل طویل وقفہ کے لئے دار العلوم آکر قیام فرماتے، اساتذہ کی رہنمائی فرماتے، درجات میں جاتے اور کبھی کبھی خود درس دیتے، وہ ندوہ کے کاموں میں ڈاکٹر صاحب کے کلی طور پر پشت پناہ ہوتے تھے اور ناہموار حالات میں سینہ سپر بن جاتے۔

مولانا مسعود علی صاحب کے قیام کا آغاز دار العلوم کی مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں ہوا، جس کی صورت گری، مالی وسائل کی فراہمی اور ابتدا وانتہا سب انہی کی سرگرمی، قوت عمل اور قوت ارادی کی رہین منت تھی، پھر ان کی دلچسپی دار العلوم سے بڑھتی گئی اور وہ اس کے انتظام اور انصرام میں شریک غالب بن گئے، نوجوان اساتذہ وکارکنوں کا انتخاب انہی کی رائے اور تجویز سے ہوا، اسی طرح معتمد مال منشی احترام علی صاحب مرحوم نے بھی پورے طور پر تعاون کیا اور یہ چار ستون وہ تھے جن کے باہمی اعتماد وتعاون کی وجہ سے ندوہ کا کام پوری ہم آہنگی اور یکجہتی کے ساتھ انجام پاتا رہا، ڈاکٹر صاحب کے واضح دینی رجحان اور طلباء میں دینی رخ پیدا ہونے کی پرزور خواہش اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی وہمت افزائی سے دار العلوم کی اندرونی زندگی اور طلباء کے اخلاق ومعاشرت میں دینداری

www.abulhasanalinadwi.org

اور شعائر دینی کے مزید احترام کا رنگ نمایاں ہونے لگا، اسی زمانہ میں بعض اساتذہ وطلبہ کو مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تبلیغی واصلاحی دعوت سے دلچسپی پیدا ہوئی، پھر رجب ۱۳۶۲ھ (۱۸ر جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا محمد الیاس صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور دار العلوم ہی کے مہمان خانہ میں ایک ہفتہ قیام فرمایا، اس سبب سے دار العلوم کے اندر ایک نئی دینی بیداری اور ذوق پیدا ہوا جس سے ہر حیثیت سے دار العلوم کو بیش قیمت فائدہ حاصل ہوا۔

دوسری طرف علامہ تقی الدین الہلالی المراکشی کے دار العلوم میں آنے اور تین سال قیام کرنے سے (جو ڈاکٹر صاحب اور سید صاحب ہی کی تحریک سے اور کوشش سے ہوا) دار العلوم میں صحیح عربی انشاء تحریر، عربی صحافت اور عربی زبان وادب کی صحیح اصول پر تعلیم کا نیا دور شروع ہوا جس کے نتیجہ میں دار العلوم کے طلباء وفضلاء میں عربی کے متعدد ادیب وانشاء پرداز پیدا ہوئے، جن کی شہرت ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہو کر بلاد عربیہ تک پہنچی، عربی زبان وادب کا صحیح نصاب تیار ہوا اور ''الضیاء'' البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' جیسے رسائل کا اجراء ہوا جو عربی رسائل کے صف اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔

دوسرے اداروں اور شخصیتوں سے تعلق

ندوہ کی خدمت اور نظامت کی مشغولیت کے بعد ان کو سب سے زیادہ دلچسپی مدینہ طیبہ کے مدرسۃ ''العلوم الشرعیہ(۱) کی امداد واعانت کے کام سے تھی، یوں تو ان کو ہر وہ

(۱) یہ مدرسہ ۱۳۳۰ھ میں مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی مہاجر مدینہ طیبہ نے قائم کیا تھا جو حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے برادر اکبر تھے اس کا پورا نام ''مدرسۃ العلوم الشرعیہ لیتامیٰ خیر البریۃ'' تھا پہلی جنگ عمومی کے بعد حجاز میں بالعموم اور مدینہ طیبہ میں بالخصوص انھوں نے شرفا کی جو زبوں حالی، یتیم بچوں کی کسمپرسی اور ملک کی تعلیمی پسماندگی دیکھی تھی اس سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ مدرسہ قائم کیا تھا ان کے انتقال ۱۱ر شوال ۱۳۵۸ھ (۲۲ر نومبر ۱۹۳۹ء) کے بعد اس کا انتظام وانصرام ان کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمود احمد صاحب مدنی کے ہاتھ میں آیا اور عرصہ تک وہ ایک آزاد دینی مدرسہ کی طرح کام کرتا رہا، افسوس ہے کہ اب ایک ابتدائی مدرسہ کی حیثیت سے رہ گیا ہے جس میں عام نصاب پڑھایا جاتا ہے اور حکومت سے امداد ملتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

چیز عزیز تھی جس کی نسبت اس محبوب شہر سے تھی لیکن چونکہ یہ مدرسہ خالص علوم دینیہ کی تعلیم اور مدینہ کے یتیم وغریب بچوں کی تربیت وکفالت کیلئے قائم کیا گیا تھا، اس لئے وہ دل وجان سے اس کی خدمت میں مصرف رہتے تھے، انہوں نے اس کے لئے عطیے اور اعانتیں جمع کرنے کیلئے ۱۹۳۱ء میں ''معین مدرسہ علوم شرعیہ'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے وہ خود صدر تھے اور مولوی اشرف علی دیوبندی مرحوم (ملازم محکمۂ ڈاک لکھنؤ) ناظم اور مولوی عبدالرؤف صاحب سرگرم کارکن تھے، وہ بڑی دلسوزی اور ذوق وشوق سے اس کے لئے چندہ کی اپیل کرتے، جن لوگوں کا وعدہ ہوتا ان سے وصول کرواتے پھر اسکو مولانا سید محمود احمد صاحب کے پاس مدینہ طیبہ بھجواتے۔(۱)

ان کو شروع سے غیر مسلموں میں، بالخصوص، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے پس ماندہ اور پامال طبقوں اور برادریوں میں تبلیغ اور ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بڑا ذوق تھا اور وہ ان کی زندگی کا محبوب ترین موضوع ومشغلہ تھا، آخر تک وہ اس کام کیطرف متوجہ رہے، بہت جگہ مکاتب قائم کئے جن کو ندوۃ العلماء کے تبلیغی فنڈ سے امداد دلائی، خود بعض موقعوں پر ان برادریوں کی تقریبات واجتماعات میں ان کا دل بڑھانے کے لئے شرکت کی، متعدد بچوں کو دار العلوم میں رکھ کر پڑھوایا، اسی مقصد کے لئے دار العلوم کے ایک فاضل اور صالح نوجوان مولوی سکندر علی صاحب ندوی مرحوم کو تیار کیا، ان کی دینی تربیت کے لئے ان کو کچھ عرصہ کے لئے تھانہ بھون بھی بھیجا، اسی غرض کیلئے انہوں نے ندوہ کے ایک فاضل مولوی نجم الدین صاحب قدوائی کی خدمات حاصل کیں اور وہ اسی مقصد کے لئے عرصہ تک شہر ناگپور میں مقیم رہے، جو اس وقت غیر

(۱) مدرسہ کی روداد سال سیزدھم (۱۳۵۲ھ-۱۳۵۳ھ) میں صفحہ ۱۲۱ پر زیر عنوان ''زریں کارنامہ'' انجمن معین مدرسہ علوم شرعیہ لکھنؤ کے صدر اور ناظم کی مساعی جمیلہ کا اعتراف کیا گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مسلموں میں تبلیغ کا ایک اہم مرکز بنا ہوا تھا، آخر آخر تک وہ اس کوشش میں لگے رہے، ان کو متوجہ اور خوش کرنے کیلئے یہ عنوان سب سے زیادہ مؤثر اور پرکشش تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ایسی باہمہ و بے ہمہ اور ایسی مرنجاں مرنج قسم کی واقع ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی ہر دلعزیزی عطا فرمائی تھی کہ بہت سے متنازعہ فیہ مسائل میں اور باہمی کشمکش کے مواقع پر ان کو ثالث یا جلسہ کا صدر بنایا جاتا اور دونوں فریق اس انتخاب پر رضامند اور متفق ہو جاتے، اس طرح باوجود اسکے کہ وہ کسی تحریک میں سرگرم حصہ نہیں لیتے تھے، ان پر اعتماد کا اظہار کیا گیا اور لکھنؤ کے بہت سے جلسوں کی انہوں نے خاموش صدارت کی۔

۱۳۶۷ھ اپریل ۱۹۴۸ء میں ''جمعیۃ العلماء ہند'' کا آل انڈیا جلسہ لکھنؤ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ کی صدارت میں ہونا طے پایا، ڈاکٹر صاحب اس کے صدر استقبالیہ منتخب ہوئے، انہوں نے اس موقع پر جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا، وہ اگرچہ جوشِ خطابت و زورِ انشاء سے خالی تھا لیکن بڑا حقیقت پسندانہ، پرمغز اور فکر انگیز تھا۔

یہ خطبہ مجلس استقبالیہ کے عام خطبات کی روش سے علاحدہ ہے جن میں زیادہ تر مہمانوں کا شکریہ، ان کی زحمت و تکلیف فرمائی پر معذرت اور اپنے شہر کے تاریخی تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف اس خطبہ میں چند نہایت مفید عملی مشورے دیئے گئے ہیں، جو جمعیۃ کے کارکنوں کے ذہن و کردار میں تبدیلی اور جمعیۃ کے کام میں ترقی و وسعت اور تاثیر و گہرائی پیدا ہونے کا باعث ہو سکتے تھے، انہوں نے اس خطبہ میں خاص طور پر زور دیا کہ سیاسی قوت کی اخلاقی بنیاد ہونی چاہئے، وہ لکھتے ہیں:

''حضرات! سیاسی قوت کی بنیاد اگر اخلاقی قوت پر نہ رکھی گئی ہو تو اس میں وہی خامیاں ہوں گی جو اس وقت پائی جا رہی ہیں، ہندوستان کی آزادی کی

www.abulhasanalinadwi.org

جدوجہد میں تاخیر کی گنجائش نہ تھی، اس کے ساتھ ساتھ جتنی اخلاقی اصلاح کی کوشش ممکن تھی، کی گئی، اب جبکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہند آزاد ہو چکا ہے، اپنی تمام تر توجہ اخلاقی اصلاح وترقی کی طرف منعطف کرنے اور پورے ملک کو اس میں پوری قوت کے ساتھ لگ جانے کی ضرورت ہے، اس جدوجہد میں مسلمانوں کو پورا حصہ لینا بلکہ رہنمائی کا فرض ادا کرنا چاہئے، سائنس کی ترقیوں نے موجودہ دور میں تمام عالم کے ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب اور مربوط کر دیا ہے، جس طرح ایک ملک کی بیماری دوسرے ملک پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی اسی طرح اخلاقی بیماریاں اور فتنہ وفساد ایک ملک سے دوسرے ملک میں تیزی کے ساتھ پھیلتے ہیں، اب دنیا کے حصے ایک دوسرے سے بے پرواہ ہو کر نہیں رہ سکتے، جس طرح پر کہ ایک جہاز کے اوپر کے درجہ والے نیچے کے درجہ والوں کے ڈوبنے اور بچنے سے بے تعلق نہیں رہ سکتے، ٹھیک اسی طرح دنیا کے ایک ملک والے دوسرے ملک والوں کی سلامتی اور تباہی سے بے تعلق نہیں رہ سکتے، ایک جگہ کی بربادی دوسری جگہ کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، اس لئے ہند کی آزادی کے بعد ہمیں اپنا مقصد بلند نظر وسیع کرنا ہے، ضرورت ہے کہ ہند کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کی کوشش کی جائے، اگر تمام مادی قوتوں کے ہوتے ہوئے ہند اخلاقی اعتبار سے بلند ترین سطح پر پہنچ سکا، تب یہ ملک اس قابل ہوگا کہ دنیا کی مظلوم اقوام کو اس ظلم وستم سے نجات دلا سکے جس میں صدیوں سے وہ گرفتار ہیں، حق وانصاف کی حمایت اور مظلوموں کی مدد کی ذمہ داری مسلمانوں پر سب سے زیادہ ہے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ

www.abulhasanalinadwi.org

ان مظلوم اقوام میں مسلمان ہی زیادہ ہیں، مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنی اور اہل وطن کے کردار کی تعمیر کو اولین فریضہ سمجھتے ہوئے پوری کوشش کریں تاکہ اخلاقی بنیاد پر ہند کی مادی قوت کی تعمیر کی جاسکے اور ہند، ایشیا اور افریقہ کی مظلوم اقوام کی دستگیری کا شاندار فریضہ ادا کرنے کے قابل ہوسکے۔،،

دوسری بات جس پر انہوں نے زور دیا وہ یہ تھی کہ جمیعتہ کے کارکن خاص طور پر اور مسلمان عام طور پر ملک کے سماجی کاموں میں شرکت کریں، انہوں نے فرمایا:

''تنگ نظری کو مٹانے کے لئے اسکی ضرورت ہے کہ مسلمان ان کاموں اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں شریک ہوکر ملک کی خدمت کریں، اس طور پر مسلمانوں کو غیر مسلم بھائیوں کو اور غیر مسلموں کو مسلمانوں سے قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا اور ملک کی سماجی خدمت میں دونوں کی شرکت سے یگانگت پیدا ہوگی۔،،

عملی کاموں کے سلسلہ میں انہوں نے مکاتب کے قیام، اسکولوں میں دینیات کا انتظام، بالغوں کی دینی تربیت، نظام قضا و اوقاف کے اجراء پر زور دیا۔

لیکن اس سب میں روح، قوت، تاثیر اور قبولیت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اس پر زور دیا کہ جمیعتہ کے تمام کارکنوں کی ساری جدوجہد، دوڑ دھوپ اور سرگرمیوں کی ایمانی واخروی بنیادی ہونی چاہئے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''ایمان واحتساب'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلائی جو روشن ومعروف ہونے کے باوجود خاص اسباب کی بنا پر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا اور اس کی وجہ سے جمیعتہ کے کارکنوں کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا اور ایک زریں موقع ان کے ہاتھ سے نکلا جارہا تھا، وہ یہ کہ تنظیم کے قدیم سیاسی مزاج اور ملک کے سیاسی حالات اور ضرورتوں کی وجہ سے بہت کم لوگوں کو یہ یاد رہا تھا کہ ان کی

www.abulhasanalinadwi.org

تحریک کا قائد اور روح رواں، ایک بلند پایہ شیخ طریقت، روحانی مربی اور مصلح بھی ہے اور وہ اس سے یہ دولت باطنی حاصل کر کے خود بھی بہت بڑا فائدہ اٹھا سکتے اور ہزاروں بندگان خدا کو پہنچا سکتے ہیں، وہ مولانا مدنی کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں دیکھتے تھے کہ مولانا کی خدمت میں حاضری دینے والوں کا ذہن ان کے اصل کمال سے استفادہ کرنے کی طرف بہت کم جاتا تھا اور وہ مولانا اور دوسرے سیاسی رہنماؤں میں کم فرق کرتے تھے، انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی اور درحقیقت یہی نکتہ اس پورے خطبہ کی جان ہے، وہ فرماتے ہیں:

''حضرات! ایک اور اہم امر کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا ہے، ہم مسلمانانِ ہند کی خوش قسمتی ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی اس نازک دور میں جمیعۃ العلماء کے صدر رہے ہیں اور امسال بھی رہیں گے، حضرت والا کی صدارت سے مسلمانانِ ہند کو جو قوت حاصل رہی ہے وہ آپ سب پر روشن ہے، مگر حضرت کی صدارت کے دوران میں جتنا نفع آپ حضرات کو اٹھانا چاہئے تھا، وہ نہیں اٹھایا، خصوصاً جس شعبہ کے آپ امام ہیں، یعنی تعلق باللہ، اتباع سنت اور ذکر و مشغولیت باطنی، افسوس ہے کہ ہمارے سیاسی کارکن اس شعبہ میں حضرت سے استفادہ کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے، اس سال پھر موقع ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، تاریخ عالم میں ایسے مواقع شاذ و نادر آتے ہیں کہ ایسی بابرکت ذات کی رہنمائی کسی قوم کو حاصل رہی ہو، حضرت کی رہنمائی میں جمیعۃ العلماء کا کام اور مسلمانوں کی خدمت اس نیت سے کرنے کی عادت ڈالئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کا ذریعہ بنے گی، اگر آپ نے نیت درست کر لی

www.abulhasanalinadwi.org

تو انشاء اللہ آپ کو یہ دولتِ قرب و رضا نصیب ہوگی، آپ کے ایمان میں برکت ہوگی اور آپ ترقی کی راہ پر چل پڑیں گے،،۔

۱۹۵۸ء، ۱۳۷۷ھ میں وہ دار العلوم دیوبند کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے اور آخیر زندگی تک رہے، لیکن اپنی مصروفیت اور سفروں کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کے کسی جلسہ میں شرکت نہ کر سکے۔

ان کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی دعوت سے بہت شغف اور ان کی ذات سے بڑی عقیدت تھی، جب مولانا رجب ۱۳۶۲ھ جولائی ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام رہا تو کچھ وقت ڈاکٹر صاحب کے مکان پر بھی گزارا، پھر ۱۳۶۳ھ مارچ ۱۹۴۴ء میں باوجود اس کے کہ سفر ڈاکٹر صاحب کے لئے نہایت دشوار تھا، وہ نظام الدین تشریف لے گئے اور کئی روز مولانا کی خدمت میں قیام فرمایا، مولانا کو اس آمد سے بڑی مسرت ہوئی، جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مولانا نے یہ شعر پڑھا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اگست ۱۹۳۸ء میں جب حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھنؤ تشریف لائے اور ایک پورا چلّہ یہاں قیام فرمایا، تو ڈاکٹر صاحب کا روزانہ کا معمول تھا کہ نماز عصر کے بعد "مسجد خواص" کی مجلس میں شرکت کرتے اور نماز مغرب کے بعد واپس آتے، مولانا نے اپنی علالت کی وجہ سے شہر میں کسی کی دعوت قبول نہیں فرمائی اور نہ کہیں تشریف لے گئے، لیکن جب روانگی میں دو روز باقی تھے (۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء) تو اچانک عمومی مجلس میں ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ "میرا آپ کے گھر پر آنے کا جی چاہتا ہے اور میں بعد مغرب

www.abulhasanalinadwi.org

چلوں گا" چنانچہ مسجد خواص سے نکل کر پیدل ڈاکٹر صاحب کے مطب میں تشریف لائے اور تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھ کر واپس تشریف لے گئے۔(۱) اس کے بعد اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی اور ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام فرمایا، اس زمانہ میں بھی ڈاکٹر صاحب برابر حاضری دیتے رہے اور پابندی سے مجالس میں شرکت کی۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں وہ روزانہ پابندی سے مجلسوں میں شریک ہوتے، مولانا بھی متعدد بار مکان پر تشریف لائے، ایک مرتبہ فرمایا: کہ "ڈاکٹر صاحب بڑے بابرکت آدمی ہیں۔"

فرنگی محل لکھنؤ سے اس خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے، اس کے متعدد نامور افراد اپنے اپنے وقت میں علماء فرنگی محل یا ان کے تلامذہ کے شاگرد ہوتے چلے آئے تھے، ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں حضرات فرنگی محل کا ربط زیادہ ہو گیا تھا اور وہ وہاں کے عمومی معالج بن گئے تھے، یوں تو سبھی حضرات عنایت فرماتے تھے لیکن مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلیؒ کا تعلق محبت سے بڑھ کر عقیدت تک پہنچ گیا تھا، انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا اور خوشخط لکھوا کر پیش بھی کیا تھا جو ڈاکٹر صاحب نے خلاف مزاج ان کے خلوص کی قدر اور ان کے لحاظ واحترام میں ان کی زبان سے سنا بھی تھا۔(۲)

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ سے بھی قدیم تعلقات کی بناء پر خصوصی ربط وتعلق تھا، مولانا بھی ڈاکٹر صاحب کا بڑا لحاظ واحترام فرماتے تھے اور ڈاکٹر صاحب بھی ان کی پاکیزہ نفسی، للّٰہیت اور دینی خدمات کے معترف تھے، ان کو اگرچہ مدح صحابہ کے جلوس کے بارے میں شرح صدر نہ تھا لیکن صحابہ کرام کے مناقب کی تشہیر اور مسلمانوں کو ان کے مقام وحقوق سے متعارف کرنے میں مولانا نے جو اہم خدمت

(۱) اس واقعہ کا تذکرہ ذرا تفصیل سے "الفضل للوصل" ص/۱۵۳ پر ہے۔(۲) اس قصیدہ پر ۸/رجب ۱۳۴۸ھ (۱۰/دسمبر ۱۹۲۹ء) کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

کے قدردان اور معترف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا حلقۂ احباب وسیع نہ تھا، اپنے بعض ہم عمر یا ہم سبق ساتھیوں سے بے تکلف اور ان سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، شیخ خلیل عرب صاحبؒ سے، جو غالباً ندوہ میں ان کے ہم سبق بھی رہے تھے اور ان کے خاندان سے استادی اور شاگردی کے دو پشتوں کے تعلقات تھے، ان کے تعلقات سب سے زیادہ مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ سے تھے جن میں باہم بہت دوستی اور ربط وضبط تھا، اس محدود حلقہ کے باہر بہت سی باتوں میں مناسبت اور بہت سے کاموں میں مشارکت تھی، آخر میں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ سے ندوہ کے کاموں میں شریک رہنے کی وجہ سے بہت اُنس وانبساط بڑھ گیا تھا، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ سے بھی بہت یگانگت اور موانست رکھتے تھے، مولانا کو بھی ڈاکٹر صاحب سے گہرا تعلق تھا جسکا اظہار اس نوٹ کے لفظ لفظ سے ہوتا ہے جو مولانا نے ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر ''صدق'' میں لکھا تھا۔

عام الحزن

۱۶ر محرم ۱۳۷۷ھ ۳۱ر اگست ۱۹۵۷ء میں آپ کی اہلیہ صاحبہ نے اچانک انتقال کیا، اس طویل رفاقت کے ختم ہوجانے اور حادثہ کے اچانک طور پر پیش آنے سے آپ کے دردمند وحساس دل پر بڑا اثر پڑا اور طبیعت افسردہ اور مضمحل رہنے لگی، ادھر مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی طبیعت مسلسل ناساز رہنے لگی اور علالت نے نازک صورت اختیار کرلی، ڈاکٹر صاحب اسی زمانہ میں مولانا کو دیکھنے دیوبند گئے، یہ دیوبند کی تعلیم کے بعد پہلا سفر تھا جسکی نوبت ۴۴، ۴۵ سال کے بعد آئی، مولانا آپ کی آمد سے بہت مسرور ہوئے اور کئی بار مسرت کا اظہار کیا، نماز میں اہتمام تھا کہ وہ آپ

www.abulhasanalinadwi.org

کے پہلو میں کھڑے ہوں، اگر بیچ میں کوئی آجاتا تو آپ کو ناگواری ہوتی اور وہ آپ کی یہ ادا دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ جاتا۔

مولانا کا ایماء پاکر آپ نے اپنے قیام میں کچھ اضافہ کیا، واپسی میں ایک شب کے لئے رائے پور حاضر ہوئے، حضرت رائے پوری بھی اس غیر متوقع آمد پر بہت خوش ہوئے، آمد ورفت میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے ملاقات اور ان کی قیام گاہ پر تھوڑا سا وقت گزارنے کا موقع ملا۔

۱۳ر جمادی الاول ۱۳۷۷ھ (دسمبر ۱۹۵۷ء) میں مولانا مدنی نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، اس خبر سے ڈاکٹر صاحب کے دل پر بڑا اثر ہوا اور ان کی طبیعت مستقل طور پر مضمحل اور افسردہ رہنے لگی، اس طرح یہ سال پے در پے صدموں کی بناء پر ان کیلئے ''عام الحزن'' بن گیا۔

علالت اور وفات

ڈاکٹر صاحب کو تقریباً ۵۶، ۵۷ء سے فشار دم (ہائی بلڈ پریشر) کی شکایت ہوگئی تھی، اسکے نتیجہ میں قلب پر بھی اثر تھا، ۱۹۶۰ء میں، جب راقم سطور رنگون گیا ہوا تھا ان کی طبیعت خراب ہوئی، اندیشہ تھا کہ شاید ملاقات سے بھی محرومی رہے لیکن خدا نے فضل فرمایا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً مرض کا حملہ ہوتا رہا یہاں تک کہ قلب پورے طور پر متاثر ہوگیا، محبی ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نے بڑے خلوص اور دلسوزی سے علاج وتیمارداری کی، جس کا ڈاکٹر صاحب بڑے تشکر کیساتھ اظہار کرتے تھے، میرے مسلسل اور پے در پے سفروں کو دیکھ کر ان کو اندیشہ تھا کہ وقت موعود آپہنچے اور میں موجود نہ ہوں، عزیزی محمد ثانی سے فرمایا کہ ''علی سفر بہت کرتے ہیں، اس کا امکان ہے کہ وہ اس

www.abulhasanalinadwi.org

وقت موجود نہ ہوں، ایسے موقعہ پر نماز پڑھانے میں تکلف نہ کرنا" چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ ۷ مئی ۱۹۶۱ء کو شدید قلبی دورہ پڑا، ان کے ایک پرانے کلاس فیلو ڈاکٹر بھاٹیہ جو شہر کے نامور معالج امراض قلب تھے، بلائے گئے، وہ آئے اور انہوں نے اس کی شکایت کی کہ ان کو ابھی تک کیوں اطلاع نہیں کی گئی، ڈاکٹر صاحب نے جواب میں چند لفظ ہی کہے تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، یہ تقریباً ۱ بجے دن ۷ مئی ۱۹۶۱ء کا واقعہ ہے، میں اس دن سہارنپور میں تھا، علالت کی نزاکت کی اطلاع ٹرنک کال سے کی گئی اور شام کو روانہ ہو کر صبح کو لکھنؤ پہنچا تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا اور جو داغ ان کو اپنے والد ماجد کے انتقال پر لگا تھا وہی داغ میرے نصیب میں بھی آیا۔

جنازہ میں بڑا اژدھام تھا، پس ماندگان اور اعزاء کی خواہش پر حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ نے نماز پڑھائی اور نعش رات کو رائے بریلی منتقل کی گئی جہاں دوبارہ نماز جنازہ ہوئی جسکی امامت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ نے کی، فجر کی نماز کے بعد حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے حظیرہ میں سپرد خاک کئے گئے، دوہی تین گھنٹہ کے بعد میرا پہنچنا ہوا اور ناز بردار بھائی اور مربی کی آخری زیارت کے بجائے اس کی تربت پر دو آنسو بہانا اور فاتحہ پڑھنا نصیب ہوا۔

پسماندگان میں ایک فرزند مولوی محمد الحسنی سلمہ مدیر "البعث الاسلامی" اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں، ان سب کی شادیوں سے انہوں نے اپنی زندگی میں فراغت پائی تھی اور ماشاء اللہ سب صاحب اولاد ہیں، ان کی شادیاں جس سادگی اور طریقۂ سنت کے مطابق انجام دیں وہ بھی ایک یادگار بات اور اس زمانہ میں ایسی عزیمت کا کام تھا جس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی۔

●●●

www.abulhasanalinadwi.org

باب سوم

امتیازات وخصوصیات

حلیہ اور چند خصوصیات وامتیازات

ڈاکٹر صاحب نہایت خوبصورت وحسین تھے، سرخ وسفید رنگ، بدن دہرا، قدمائل بہ پستی، چہرہ پر معصومیت اتنی نمایاں تھی کہ دل کھنچتا تھا اور قلب شہادت دیتا تھا کہ اس شخص میں شر اور کسی کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت ہی نہیں، انتقال کے بعد دیکھا گیا تو چہرہ نہایت شاداب وخوبصورت تھا، جسم بہت نرم تازہ اور موت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

نہایت کم گو اور کم سخن تھے، ضرورت سے زائد بولنے کا گویا انہوں نے سبق ہی نہیں پڑھا تھا، نپی تلی بات، جچی تلی تحریر، متن ہی متن جس میں نہ اطناب، نہ مبالغہ(۱)

(۱) میرے عزیز دوست حکیم عبدالقوی صاحب بی۔اے، منیجر صدق جدید نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے طب کی کتابیں پڑھیں، انھوں نے یہ لطیفہ سنایا کہ میں عرصہ تک ڈاکٹر صاحب سے پڑھتا رہا، نہ انھوں نے میرا نام پوچھا نہ میں نے بتایا، میری زیر درس کتابوں پر میرا نام لکھا رہتا تھا، اس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہ میرے نام سے واقف ہو گئے ہوں گے، کہتے تھے کہ ایک مرتبہ چچا جان (مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدظلہ) اور شفاء الملک حکیم عبدالحبیب صاحب، ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے، چچا جان نے پوچھا آفتاب (حکیم عبدالقوی صاحب کا گھریلو نام) کا کیا حال ہے، ڈاکٹر صاحب خاموش رہے، دوبارہ، سہ بارہ پوچھنے پر کہا کہ "مجھے نجوم میں کچھ دخل نہیں" چچا جان نے فرمایا کہ عبدالقوی کا کیا حال ہے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "ان کا نام عبدالقوی ہے؟"

www.abulhasanalinadwi.org

لباس بہت سادہ، جس کے آگے ان کی حیثیت کے آدمی کے لئے گویا کوئی گنجائش نہیں، کھانے میں معلوم ہوتا تھا کہ نہ ان کو کسی خاص چیز سے دلچسپی ہے، نہ کسی غذا سے اِباء وتنفر، فرمائش کرنا جانتے ہی نہ تھے، کھانے میں عیب نکالنا ان کے مذہب میں گویا ناجائز تھا۔

طبیعت ہمیشہ سے جفاکش واقع ہوئی تھی، معمولی کپڑے قطع کرنا اور سینا جانتے تھے، ضروری کھانا پکالیتے اور ضرورت کے وقت کپڑا بھی دھو لیتے، تیمارداری جو سب سے مشکل کام ہے، ان کے لئے بہت آسان تھا، جب صحت اور جوانی تھی، رات رات بھر جاگ کر عزیز مریضوں کی تیمارداری کرتے، نمود ونمائش اور جاہ طلبی سے فطرتاً مناسبت نہ تھی، اس بارہ میں شاید ان کو کسی مجاہدہ اور قربانی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی، اجر وثواب ورضائے الٰہی کا خیال ان کے افعال واخلاق کے لئے اصل قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں خرچ کرنے میں ثواب سمجھتے تھے وہاں ان سے بڑھ کر فراخ دست وعالی ہمت ملنا مشکل تھا اور جہاں اس کی امید نہیں ہوتی تھی وہاں ان سے بڑھ کر محتاط اور مستغنی نظر نہیں آتا تھا، نیک نامی وبدنامی اور لوگوں کے کہنے سننے کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہ تھی، ہر ایک کے شرعی حق اور مرتبہ کے مطابق سلوک کرتے اور جس وقت شریعت کا جو حکم اور منشا سمجھتے اس میں تساہل اور سستی سے کام نہ لیتے۔

جب تک والد صاحب حیات رہے، ہم بھائی بہنوں کو ان کی کسی خاص شفقت ومحبت کا احساس نہیں ہوا، وہ اپنے مطالعہ اور تعلیم میں ہمہ تن منہمک ومستغرق رہتے تھے لیکن جیسے ہی ہم لوگ اس سایہ سے محروم ہوئے معلوم ہوا ان کے اندر سے ایک نئی شخصیت نمودار ہوئی جس نے شفیق باپ کی جگہ لے لی، پھر وہ ناز بردار بھائی تھے اور شفیق باپ، جس نے اپنے طرز عمل سے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہم لوگ

www.abulhasanalinadwi.org

باپ کے سایہ سے محروم ہو چکے ہیں۔

ان کی ذات جامعیت کا عجیب نمونہ تھی، وہ محلّہ کی مسجد کے باقاعدہ امام تھے، جہاں جمعہ اور پنج وقتہ نماز کی پابندی سے امامت کرتے، محلّہ کے مذہبی پیشوا اور دینی معتمد علیہ بھی تھے اور کامیاب اور نامور معالج وڈاکٹر بھی۔(۱)

وہ ہر چیز میں پختہ تھے، پختہ اعتقاد، پختہ دینداری، پختہ علمی استعداد، پختہ خیالات ونظریات، وہ اسلام کی ابدیت، اسلامی تہذیب کی برتری وپاکیزگی اور اسلاف ومتقدمین کی اخلاقی وروحانی اور انسانی عظمت کے شدت سے قائل تھے، مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور اس کے نظام تعلیم کے سایہ میں برسوں رہنے کے باوجود وہ اس کے سخت ناقد تھے، لیکن ان کی تنقید جذباتی وسطحی نہیں تھی، وہ علم ومطالعہ پر مبنی تھی، ان کی مجلسوں میں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی اور اس پر اصولی تنقید ہوتی تھی، راقم سطور کو ان مجلسوں سے جو فائدہ پہنچا وہ مغربی تہذیب اور موجودہ نظام حیات پر درجنوں کتابیں پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا، ان کے اس طریقِ فکر کا اندازہ ان کے ایک خط کے اقتباس سے ہوسکتا ہے، جو انہوں نے میرے لاہور کے پہلے سفر (مئی ۱۹۲۹ء) ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ کے موقعہ پر میرے اور اپنے ایک بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب (۲) کو لکھا تھا، جن کی خدمت میں میں گیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

(۱) یہاں پر یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ میوات کے مشہور بزرگ اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم ورفیق حاجی عبدالرحمن صاحب ایک مرتبہ ان کے پاس بغرض علاج آئے، اتفاق سے نماز کا وقت تھا، انہوں نے ''مسجد نوازی'' میں نماز پڑھی، پھر جب ڈاکٹر صاحب کے مطب آئے تو دیکھا کہ جس شخص نے نماز پڑھائی تھی وہی مریضوں کو دیکھ رہا تھا اور انگریزی نسخے لکھ رہا تھا، وہ تھوڑی دیر کے لئے شبہے میں پڑ گئے کہ ان کی نظر غلطی کر رہی ہے یا ایک ہی شخص بیک وقت امام مسجد بھی ہے اور طب جدید کا ماہر بھی۔ (۲) مولانا سید طلحہ ایم اے، بخشی الملک سید محمد خاں ظفر جنگ بہادر کے صاحبزادے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے بڑے بھانجے مولوی سید محمد علی صاحب ''مخزن احمدی'' کے پرپوتے ہیں، ۱۳۰۸ھ میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے، ۱۰ سال کی عمر میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے ساتھ لکھنؤ آئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور مولانا فاروق صاحب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

www.abulhasanalinadwi.org

''ان پر یہ نقش کر دیجئے کہ موجودہ تمدن کی آب وتاب سطحی اور کھوکھلی ہے اور ہمارے آباء کرام کا طریقہ ہمارے لئے ہمیشہ قابل تقلید رہے گا، خواہ ہم کتنی ہی علمی واقتصادی ترقی نہ کرلیں، خدا کا شکر ہے، ہمارے اسلاف ذاتی کمالات، (نہ کہ اضافی) سیرت اور تقویٰ میں ایسے تھے جن کی نظیر اللہ تعالےٰ نے نہیں پیدا کی، ہماری بدنصیبی ہوگی اگر ہم ان سے بے خبر رہیں اور ان کے اتباع سے محروم رہ جائیں، ان کو بتادیجئے کہ انکی عملی زندگی ہمارے منتہائے تخیل سے بھی بدرجہا بلند تھی، ہمارا مطمحِ نظر اس سے بدرجہا پست ہے، آدمیت، علم ودولت وتہذیب سے بہت اونچی چیز ہے۔،،(۱)

اسی طرح ان کی علمی استعداد نہایت پختہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا محنت سے پڑھا اور اس کو ان کے ذہن نے پورے طور پر ہضم کرلیا ہے، صرف ونحو، عربیت سے لے کر قرآن وحدیث تک، ان کا علم ومطالعہ اگر چہ زیادہ وسیع نہ تھا، لیکن عمیق ومحکم تھا، مجھے ذاتی طور پر ان سے متعدد کتابیں پڑھنے کا موقع ملا اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) صاحب چریاکوٹی اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، پھر ٹونک واپس ہوکر مدرسہ ناصریہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب محدث اور مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر کابل سے درسی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد لاہور جاکر علوم مشرقیہ کے امتحانات دیئے اور امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، پھر دہلی آکر حکیم غلام رضا خان صاحب سے طب پڑھی، فراغت کے بعد صرف چار ماہ میں قرآن شریف حفظ کرلیا، ۱۳۳۵ھ میں اورنٹیل کالج لاہور میں استاد ہوئے اور اسی دوران انگریزی امتحانات دیئے اور ایم اے۔ کیا، ۱۳۶۱ھ میں کالج سے اپنی خواہش پر سبکدوشی حاصل کرلی، مولانا کو تاریخ، سوانح، حدیث، ادب ولغت، نحو وصرف، نجوم، ریاضیات اور سنین کے علم میں ید طولی حاصل تھا، عربی فارسی اردو کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے، طبیعت نہایت بے تکلف اور سادہ پائی تھی، کتابوں کے مطالعہ کا انتہائی شغف اور حافظہ قوی تھا، باوجود وفور علم اور تبحر کے ان کے علمی مرتبہ کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، ۱۳۶۷ھ میں پاکستان تشریف لے گئے، ۱۳۷۷ھ میں اپنی عربی تصنیف ''عہد صحابہ کا تمدن وثقافت'' کی تکمیل کے سلسلہ میں مصر وشام اور قسطنطنیہ کا سفر کیا اور نادر کتب خانوں کی سیر کی، ان کے ایک صاحبزادے تھے، جن کا نام داؤد ہے، افسوس ہے کہ جمعہ ۲۲ر رجب ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کو ان کا انتقال ہوگیا، رحمہ اللہ وغفرلہ۔

(۱) مکتوب ڈاکٹر صاحب بنام مولانا سید طلحہ صاحب مورخہ ۳۱ر مئی ۲۹ء شامل مرقع خطوط قلمی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اگرچہ انہوں نے باقاعدہ درس وتدریس کا کام نہیں کیا تھا لیکن دیکھا کہ بہت سہولت اور اطمینان کے ساتھ ان کتابوں کو پڑھتے تھے، انہوں نے ایک سال دارالعلوم کے ایک منتہی طالب (۱) کو کچھ عرصہ تک صحیح مسلم پڑھائی، مولوی حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی (منیجر صدق جدید) نے ان سے طب کی کتابیں پڑھیں۔

فارسی ان کی نہایت پختہ تھی اور وہ عربی اور انگریزی کے مقابلہ میں اس میں زیادہ روانی اور طلاقت کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے، اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب کابل کے مشہور ادیب وشاعر محمد سرور خاں گویا لکھنوی آئے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام کیا اور ڈاکٹر صاحب سے مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو ہوئی۔

حقیقت پسندی اور عملیت ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر گئی تھی، مبالغہ اور تخیل آرائی سے ان کو مناسبت نہ تھی، جب ''الندوہ'' کے دور آخر میں میں نے ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابوں'' کا سلسلہ شروع کیا اور ملک کے ممتاز اہل علم واہل فکر نے اس موضوع پر مضامین لکھے تو ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی محسن کتابیں کیا ہیں، انہوں نے کہا طبعیات (فزکس) کی ایک کتاب جو میں نے ابتدائے عمر میں پڑھی تھی، اس سے تجربی اور عملی علم کی وقعت پیدا ہوئی، ''دیوان حماسہ'' اور واقدی کی ''فتوح الشام'' غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان سب میں قدر مشترک حقیقت کی تلاش، حقیقت کا اظہار اور حقیقت کیلئے جدوجہد ہے۔

ان کی تربیت کے انداز بڑے حکیمانہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ مجھ میں عربی انشاء وتحریر کا سلیقہ پیدا ہو، اسی زمانہ (۱۹۲۸ء) میں مولانا محمد داؤد غزنوی نے ایک رسالہ ''توحید'' امرتسر سے نکالا تھا، اس میں مولوی محی الدین صاحب قصوری کا مسلسل

(۱) خواجہ بہاء الدین اکرمی بھٹکلی۔

www.abulhasanalinadwi.org

مضمون ''تیرہویں صدی کا مجاہد اعظم'' (حضرت سید احمد شہیدؒ) نکلنا شروع ہوا، بھائی صاحب نے مجھے یہ مضمون عربی میں ترجمہ کے لئے دیا، مقصد یہ تھا کہ اہل دعوت وعزیمت کے حالات سے دلچسپی بھی پیدا ہو اور لکھنے کا ڈھنگ بھی آئے، پھر مجھ سے کہا کہ ترجمہ کا کام شروع کرنے سے پہلے ''کامل ابن اثیر'' میں حالات ومحاربات کا حصہ پڑھو، تاکہ معلوم ہو کہ ان مطالب کو کس طرح ادا کیا جاتا ہے اور ان کے لئے کیا موزوں الفاظ ہیں، میرے لئے یہ تصنیفی زندگی کا سنگ بنیاد رہا اور اس محنت کے نتیجہ میں وہ مضمون تیار ہوا جس کو علامہ سید رشید رضا مرحوم نے ''ترجمة السيد الإمام أحمد بن عرفان الشهيد'' کے نام سے پہلے مؤقر رسالہ ''المنار'' میں پھر علیٰحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

ان کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی کہ مجھے اپنے خاندانی کتب خانہ سے واقفیت اور اپنے اسلاف کے حالات اور علمی یادگاروں سے مناسبت پیدا ہو، اس کے لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ گھر میں جو کتابی ذخیرہ تھا اس کو دھوپ دکھانے اور مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی، مشہور ہے کہ ''کوئلہ کی دلالی میں ہاتھ کالے'' ان کتابوں کے اٹھانے رکھنے سے ان کتابوں کے رکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا اور وہ وحشت جاتی رہی جو کرم خوردہ اور قلمی کتابوں سے ابتدائے عمر میں ہوا کرتی ہے۔

میں ۱۹۲۹ء میں ایک امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوا، بھائی صاحب نے مجھے بیس روپے دیئے کہ میں اپنے اساتذہ ورفقاء کی دعوت کروں، پھر کچھ وقفہ دے کر فرمایا کہ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں، لوگ ایک وقت کھانا کھالیں گے اور ذائقہ مل جائیگا، اس رقم کو ''مدرسہ علوم شرعیہ'' مدینہ منورہ بھجوادو کہ ثواب ملے اور حقیقی وديرپا فائدہ ہو، چنانچہ یہی کیا گیا۔(۱)

(۱) ۱۳۴۸ھ کی روداد سالانہ میں یہ رقم درج ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

لکھنؤ میں اپنے محلّہ کے قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب رہتے تھے جو طبی سارٹیفکٹ دینے میں بہت فراخ دل اور غیر محتاط تھے، ایک دن ان پر تنقید ہو رہی تھی (غالباً ان کا انتقال ہو چکا تھا) میں نے بھی اس موضوع سے دلچسپی لی اور ان کے اس طرزِ عمل پر تنقید کرنے لگا، بھائی صاحب نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ تم بچپن میں ایک مرتبہ بہت سخت بیمار ہو گئے تھے، انہوں نے بڑی ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ تمہارا علاج کیا، تم کو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے اور ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنا چاہئے، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

اپنے ہم عمروں اور ہمعصروں میں ان کی جو صفت بہت نمایاں تھی اور جس کا اقرار ان کے تمام جاننے والوں اور عزیزوں کو تھا، وہ اپنے والد ماجد کی فرمانبرداری اور انکو راحت پہنچانے اور خدمت کا جذبہ تھا، اس میں وہ اپنے ساتھیوں میں ضرب المثل تھے، بارہا ایسا ہوا کہ میڈیکل کالج سے پیدل چل کر گرمیوں میں گھر آئے، دوپہر کا وقت اور سخت دھوپ، آتے ہی معلوم ہوا کہ والد صاحب کا کھانا جا رہا ہے اور چٹنی کے لئے پودینہ یا دھنیا موجود نہیں، اسی وقت دم لئے بغیر فوراً پیدل سبزی منڈی گئے اور خرید کر لائے، اس سلسلہ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ وہ انگریزی کا کوئی بڑا سالانہ امتحان دے رہے تھے خاندان میں کوئی تقریب تھی جسمیں والد صاحب اپنے بجائے ان کو بھیجنا چاہتے تھے، والد صاحب کو اسکا علم نہیں تھا یا ذہول ہو گیا کہ وہ امتحان دے رہے ہیں اور ایک پرچہ چھوڑ دینے سے پورا تعلیمی سال برباد ہو جائیگا، انہوں نے ان کو بلایا اور اس تقریب میں شرکت کے لئے کانپور یا ہسوہ جانے کے لئے کہا، وہ فوراً آمادہ ہو گئے، بعد میں والد صاحب کے کسی دوست نے ان کو بتایا کہ ان کا امتحان ہو رہا ہے اور اس روز پرچہ ہے، اس وقت والد صاحب نے انہیں حکماً منع کیا

www.abulhasanalinadwi.org

امتحان ہورہا ہے اور اس روز پرچہ ہے، اس وقت والد صاحب نے انہیں حکماً منع کیا اور اس طرح وہ نقصان سے بچ گئے، مطب شروع کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قابل کیا تو انہوں نے والد صاحب کا حج بدل کروایا(۱) اور اس کے لئے خاندان کے ایک نہایت صالح بزرگ مولوی سید حسن مجتبیٰ صاحب مرحوم کا انتخاب کیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور ان کے دوستوں کے صاحبزادوں کے ساتھ ہمیشہ خصوصیت برتتے، ان کا عمل گویا اس حدیث پر تھا، ﴿إن من أبر البر بر الرجل أهل ودأبيه" (بڑی نیکی اور سعادت مندی آدمی کا اپنے والد کے تعلق والوں سے حسن سلوک ہے) وہ بہت کم دعوت کرتے تھے، لیکن جب والد صاحب کے دوستوں میں یا دوستوں کے صاحبزادوں میں سے کوئی آجاتا تو ضرور پرتکلف دعوت کرتے اور اس موقع پر بہت خوش نظر آتے۔

وہ اپنی ذاتی زندگی میں جتنے متقشف، پختہ اور قدامت پسند تھے، اپنے تعلیمی خیالات ونظریات، جدید چیزوں کے مطالعہ اور دنیا سے واقفیت کے بارہ میں اتنے ہی وسیع الخیال، حقیقت پسند اور غیر متعصب تھے، انہوں نے محبت وعقیدت میں بھی حدود قائم کر رکھے تھے، بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ ان کو جب کسی شخصیت سے عقیدت ہوئی تو انہوں نے جوش عقیدت یا فرطِ محبت میں اپنے عمر بھر کے تعلیمی خیالات ونظریات یہاں تک کہ فکر ونظر اور اسلوب تحریر میں بھی تبدیلی کر دی، لیکن ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس بارہ میں پورا اعتدال وتوازن تھا، وہ کسی دور میں بھی اپنے کسی سوچے سمجھے تعلیمی نظریہ یا تحقیق سے دست بردار نہیں ہوئے، نصاب ونظام تعلیم، تصوف واصلاح باطن، تقلید

(۱) جنگ عمومی، پھر راستہ کی بدامنی کی وجہ سے مولانا سید عبدالحی صاحبؒ حج نہیں کر سکے تھے، آخر میں انہوں نے اس کی تیاری کی تو موت نے مہلت نہ دی۔

www.abulhasanalinadwi.org

وعدم تقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال اور سیاسیات اسلامی کے بارہ میں ان کا جو مسلک جوانی اور مولانا مدنی کے تعلق سے پہلے تھا، وہ آخر تک رہا۔

وہ ایک طرف راسخ العقیدہ سنی، صحابہ کرام اور خلفاء راشدین کے پورے مرتبہ شناس اور عقیدتمند تھے، دوسری طرف سیدنا علی مرتضیٰؓ سے ان کو نہایت گہرا جذباتی لگاؤ تھا اور اہل بیت کرام سے ایسی عقیدت و محبت تھی کہ وہ ان کے بارے میں ادنیٰ تنقیص و تنقید نہیں سن سکتے تھے، ان کی بڑی تمنا تھی کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت لکھوں جسمیں ان کے مرتبہ و کمالات کا پورا اظہار ہو اور یہ دکھایا جائے کہ انہوں نے دور فتن میں امامت و استقامت کا وہی حق ادا کیا جو خلفاء سابقین نے دور اعتدال اور زمانۂ عروج و اقبال میں ادا کیا تھا، افسوس ہے کہ میں ان کی یہ تمنا پوری نہ کر سکا۔(۱)

ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے بڑی عقیدت اور انکی کتابوں سے شغف تھا اور انہی کی بار بار تاکید سے مجھے ان حضرات کی تصنیفات پڑھنے کی توفیق ہوئی، عربی اور انگریزی اخبارات پڑھنے کا ذوق انکو شروع سے تھا اور آخر تک رہا اور عربی اخبارات تو وہ اس زمانہ میں پڑھتے تھے جب شاید ہندوستان میں چند ہی آدمی پڑھتے ہوں گے، مجھے انہی کی مدد سے عربی اخبارات کی زبان کا سمجھنا آیا۔

ان صفات و علمی کمالات کے ماسوا ان کی ایک بڑی صفت اور زندگی کا جوہر ان کی دینی حمیت، عالم اسلام کی فکر اور دعوت اسلام کا جذبہ اور ذوق ہے، میں نے گوشہ نشین زندگی اور انفرادی فرائض کی مشغولیت کے ساتھ عالم اسلام کی اتنی فکر مندی، اتنی وسیع اور گہری واقفیت اور اسکے حالات و تغیرات کے تتبع کا ایسا ذوق نہیں

(۱) ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہو سکا البتہ بعد میں ''المرتضیٰ'' نام سے عربی و اردو میں کتاب شائع ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

دیکھا، ان کا اس ارشاد نبویؐ پر یقین اور عمل تھا کہ "من لم یهتم بأمر المسلمین فلیس منهم" (جس کو مسلمانوں کے معاملہ کی فکر نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے) فلسطین کا جہاد ہو یا الجزائر کی جنگ، ان کا دل اس سے متعلق تھا اور ایک بعید الوطن مسلمان پر ان کے بارے میں جو حقوق عائد ہوتے ہیں، ان کو ادا کرنے کی فکر تھی، عالم اسلام میں پیش آنے والے خوش کن یا رنج دہ حادثہ سے وہ اس طرح متاثر ہوتے تھے جیسے وہاں رہنے والے دردمند و فکرمند مسلمان، جزیرۃ العرب (۱)، حجاز مقدس اور حرمین شریفین سے ان کو ایسا گہرا تعلق تھا جو میں نے دینی حلقوں میں بھی بہت کم دیکھا ہے، عربوں سے ان کو عقلی اور جذباتی دونوں طرح کا لگاؤ تھا اور ان کو مذمت یا تحقیر گوارا نہ تھی، اس بارے میں ہم انکی ذکاوت حس سے واقف تھے اور اسکا لحاظ رکھتے تھے، اس کے باوجود ترکوں سے بھی ان کو نہایت محبت تھی اور جب کبھی ان کے دینی رجحان یا اسلام کی طرف قومی پیمانہ پر بازگشت کی اطلاع ملتی تو وہ بے حد مسرور ہوتے، اسرائیل کے بارہ میں وہ اپنے جذبات سے مجبور تھے اور یہاں ان کی دینی حمیت کا بے تکلف اظہار ہو جاتا۔

عالم اسلام اور ممالک عربیہ کے حالات، وہاں مسلمانوں کو جو مسائل و مشکلات درپیش تھے اور دعوت اسلامی اور قیادت کے جو امکانات وہاں پائے جاتے تھے، ان سے ان کی گہری واقفیت اور دلچسپی کا اندازہ ان کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے راقم سطور کو قیام مصر کے زمانہ میں لکھے، یہاں اس کے دو اقتباسات پیش

(۱) انہوں نے والد ماجد کی فرمائش پر جزیرۃ العرب کے جغرافیہ پر عربی میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہو اور جزیرۃ العرب کے جغرافیہ سے ناواقفیت کی بناء پر حدیث و سیرت اور اشعار عرب کو سمجھنے میں جو دقت ہوتی ہے، وہ رفع ہو، وہ نئی مطبوعات کی روشنی میں اس کتاب پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس ہے اس کی نوبت نہیں آئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کئے جاتے ہیں، یہ خیال رہے کہ یہ خطوط ۱۹۵۰ء و ۱۹۵۱ء میں لکھے گئے ہیں، جب افریقہ کا سیاسی نقشہ کچھ اور تھا اور کئی ملک ابھی آزاد نہیں ہوئے تھے:

''اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرمادے اور تمہیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان وکرم کے مطابق اجر عطا فرمائے، بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے مثلاً ہند، ایسے ملکوں کے غیر مسلموں میں استکبار، قبولِ حق سے بڑا مانع ہے، افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا متمدن مذہب سے نا آشنا ہے، گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے، قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی اور تمہاری کوششوں کو اللہ عزوجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبولِ حق کیلئے کھول دیں، مصر افریقہ کا دروازہ ہے، اگر اہل مصر کو اسکی ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور مغرب صحراء اعظم اور صحراء کے جنوب کے علاقوں سے جو حجاج، جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں، مصر ہو کر گزریں تو ان کو دینی جدوجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ کریں اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قرب کی غیر مسلم آبادی میں تبلیغ کے لئے نکلنے پر تیار کریں تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ نور اسلام سے منور ہو سکتا ہے، مصری سوڈان کا تعلق ایک طرف مصر سے ہے اور جنوب میں یوگنڈا، کینیا اور کانگو سے ہے، سوڈان کے لوگ بہ نسبت مصر کے تمدن جدید سے دور اور اسلام سے زیادہ قریب ہیں، مصر میں جو سوڈانی مقیم ہیں، ان میں بھی کام ہونا چاہئے، ازہر کے سوڈانی طلبہ کے ذریعہ سے تمام سوڈانیوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اور ان لوگوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے

www.abulhasanalinadwi.org

جوسوڈان کی رائے عامہ پر اثر رکھتے ہیں اور قاہرہ میں مقیم ہیں۔،،

(مکتوب ڈاکٹر سید عبدالعلی، ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۰ء)

،،سوڈان جنوب میں مشرقی افریقہ سے متصل ہے، یوگنڈا، کینیا اور حبش کا پہاڑی علاقہ اور بلجین کانگو اس سے ملے ہوئے ہیں، مغرب میں اسکا تعلق فرانسیسی سوڈان سے ہے اور فرنچ مقبوضات مغرب میں اٹلانٹک اور جنوب مغرب میں بحر تک پہنچتے ہیں، یہ قوم اتنے بڑے رقبہ میں آمد ورفت رکھتی ہے اور تجارتی قافلوں کے ساتھ ہوتی ہے، اتنے بڑے علاقہ میں اگر دین کیلئے نقل وحرکت ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ ایمان کی حلاوت نصیب کرے اور عالم میں امن وسلامتی پھیلانے کا کام ان سے لے لے، یہ قومیں تمدن سے بالکل علیٰحدہ رہی ہیں، اب اگر اسلام کے تمدن کے ساتھ اٹھیں گی تو عرب اور بربر کے اٹھنے کی طرح اٹھیں گی، انشاء اللہ صدر اسلام میں فتوحات اور تبلیغ کا سیلاب مصر سے مغرب کی طرف گیا، ساحل بحر روم پر بسنے والی بربر قومیں مسلمان ہوئیں اور اسلام کے لئے باعث تقویت ہوئیں انہیں کی وجہ سے صحرائے اعظم میں اسلام پہنچا اور اسکو پار کر کے نائیجریا اور سینی گیمبیا کی وادیوں تک پہنچا، نائیجریا اور سینی گیمبیا کی وادیوں میں مسلمان کہیں کم اور کہیں زیادہ ہیں، ان کے ساتھ وحشی کفار بھی بستے ہیں۔

یوگنڈا اور کانگو اور اس کے جنوبی علاقوں میں عموماً کفار ہیں، سوڈان کے جنوبی حصہ میں کفار بہت ہیں، جو عربی سے ناواقف ہیں، ان سب میں اسلام کی تبلیغ کرنا ہے، نیروبی، کینیا کا شہر ہے، ایک حج میں کوئی سید صاحب تمہیں ملے تھے اور اس ملک میں آنے کی دعوت دی تھی اور اگر ان

www.abulhasanalinadwi.org

کا پتہ یاد ہو تو انہیں خط لکھنا کہ سوڈان میں آ کر یا کچھ جماعت کو بھیج کر تمہیں ملیں اور سوڈان میں اپنا اتصال پیدا کرلیں۔،،

(مکتوب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم)

مورخہ ۲۲؍فروری ۱۹۵۲ء، ۲۵؍جمادی الاول ۱۳۷۱ھ

۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۱ء میں جب یہ راقم سطور حجاز و مصر و شام و فلسطین اور سوڈان کے طویل سفر سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد واپس ہوا تو طلبائے دارالعلوم کی انجمن ''الاصلاح'' نے ایک جلسہ منعقد کیا جسمیں میں نے اس سفر کی مختصر روداد سنائی، مصر و شام کے بلند پایہ مفکرین اور مختلف مکاتب خیال کے نامور زعماء و قائدین سے جو تبادلہ خیال ہوا، عربوں کو جو اس دعوت کے فطری علمبردار ہیں، ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے کی جو توفیق ہوئی، اس کا مختصر تذکرہ کیا، حاضرین جلسہ کی پہلی صف میں وہ محبوب و نورانی چہرہ بھی تھا جسکی تعلیم و تربیت اور پدرانہ شفقت سے اس کوٹوٹی پھوٹی اہلیت پیدا ہوئی اور ایک دہقانی اور عجمی کو عربوں کو ان کی زبان میں دین کا پیغام دینے اور انہیں سے پڑھا ہوا سبق ان کے سامنے دہرانے کی جرأت و صلاحیت پیدا ہوئی، تو معاً فارسی کا یہ شعر یاد آ گیا اور اس چہرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سب اسی کی تعلیم و تربیت کا فیض ہے اور اب آپ کے اس مختصر سوانحی خاکہ کو اس پر ختم کیا جاتا ہے۔

روح ''پدرم'' شاد کہ فرمود بہ استاد
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

●●●

www.abulhasanalinadwi.org

باب چہارم

تذکرۂ فرزند

محمد الحسنیؒ (محمد میاں)

جون ۱۹۷۹ء کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ تھی اور میں بمبئی میں تھا، رات کو میں نے خواب دیکھا کہ لکھنؤ میں محمد علی لین والا ہمارا پرانا مکان ہے، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا زمانہ ہے اور گھر کا وہی نقشہ ہے جو ان کی زندگی میں تھا، وہ خود زندہ وسلامت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا انتقال ہو گیا ہے، میں عالم برزخ سے اپنے پرانے مسکن میں جس میں بچپن اور جوانی گذری، گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، مجھے اس کا رنج بھی ہے کہ میں جلد ان بڑوں کو چھوڑ کو چلا جاؤں گا اور تھوڑا سا سہم بھی کہ مجھے قبر میں جانا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا افسوس بھی کر رہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، خواب ہی میں مجھے اس کا شعور ہے کہ بھائی صاحب نے عمر طبعی پائی (۱) اور میں اس عمر کو نہیں پہنچا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں، خاص طور

---

(۱) ان کا انتقال ہجری حساب سے ۶۹ سال کی عمر میں ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

سے معنی خیز، جن میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ یا کسی امر کا انکشاف ہو، دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟

غالباً اگلے ہی دن شب میں ایک دوست کے یہاں سے دیر میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ میرے بھتیجے محمد میاں اچانک علیل ہو گئے، ان کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، میں جتنی جلدی ہو سکے لکھنؤ پہنچ جاؤں، ہونے والی بات، یہ سنتے ہی دل پر غیر معمولی اثر ہوا، جو عزیزوں کی علالت کی عام اطلاع سے نہیں ہوا کرتا، وسط مئی میں جب میں ''پیام انسانیت'' کے کام کے لئے کرناٹک کے دورہ پر روانہ ہوا تھا تو محمد میاں اچھے خاصے اور چاق و چوبند تھے، وہ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور کبھی ایسے بیمار بھی نہیں ہوئے تھے جس سے آئندہ کے لئے فکر و تردد پیدا ہو، لیکن سنتے ہی ماتھا ٹھنک گیا کہ اللہ خیر کرے، ایسے غیر معمولی طریقہ پر اطلاع دینے کا اہتمام کیا گیا ہے، طبیعت پر فکر و تردد سے زیادہ حزن و یاس کی ایک کیفیت طاری ہو گئی، خواب بھی یاد آیا، دنیا میں اگر (اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے احساس کے ساتھ) میرا کوئی مثیل بلکہ ''صورت مثالی'' ہو سکتا ہے تو محمد میاں ہی ہو سکتے ہیں، وہ جب بچے تھے تو ان کی والدہ مرحومہ دعا کرتی تھیں کہ وہ اپنے چچا کے بالکل مثیل ہوں، اور اردو کے زنانہ محاورہ کے مطابق ''اپنے چچا کو پڑیں'' اور انہی کا نمونہ ہوں اللہ نے جن کو دو پیدا کیا ہے وہ دو ہی رہتے ہیں، پورے طور پر ایک کبھی نہیں ہو سکتے، لیکن دو میں جو زیادہ سے زیادہ وحدت، مماثلت اور مشابہت ہو سکتی ہے وہ ہم دونوں چچا بھتیجے میں تھی، اس کا گواہ خاندان کا ایک ایک فرد ہے، اس لئے دل کو اور دھڑکا لگ گیا کہ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے؟ کہیں میں نے اپنی شکل میں ان کی مفارقت کو نہ دیکھا ہو۔

www.abulhasanalinadwi.org

واقعہ اسی شب میں پیش آچکا تھا، لیکن میرے رفیق سفر اور معاون مولوی معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) نے ٹیلیفون پر یہ خبر سن کر بھی مجھ سے چھپایا کہ شاید میں سفر کے قابل بھی نہ رہ سکوں اور تھوڑی سی جو امید ان کا آخری دیدار کر لینے اور ان کی آخری خدمت میں شریک ہونے کی ہے وہ بھی جاتی رہے گی، میرے مزاج وجذبات کے لحاظ سے یہ بات بعید از قیاس بھی نہ تھی، میرے مخلص ومحسن میزبان محمد بھائی (مالک بمبئی، آندھرا ٹرانسپورٹ) نے، جن کی کوٹھی میں میں ٹھہرا ہوا تھا اور ان کے تمام گھر والوں نے، علم کے باوجود مجھے اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

ٹیلیفون کا پیغام پہنچنے کے بعد ہی ہم لوگ ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے کہ پہلی پرواز سے دہلی اور صبح کی پرواز سے لکھنؤ پہنچ جائیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ محرومی نہ ہوتی جو قسمت میں لکھی تھی اور جو ان کے والد اور اپنے باپ کی طرح بھائی کے معاملہ میں اس سے پہلے (مئی ۶۱ء میں) پیش آچکی تھی اور اس کا داغ زندگی بھر رہے گا، مولوی معین اللہ صاحب نے یہ بھی انتظام کر لیا تھا کہ دہلی میں بھی یہ بات مجھ سے راز رہے اور لکھنؤ پہنچ کر ہی مجھے اس روح فرسا واقعہ کا علم ہو، پھر اللہ ہی حافظ وناصر ہے، وہی ڈوبتوں کو سہارا دیتا ہے، وہی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے، قسمت کی نیرنگی، کہ بڑی کوشش اور اس کے باوجود کہ ہوائی اڈہ کے عملہ کے بعض لوگوں سے ہمارے میزبان کے تعلقات بھی تھے، نصف شب میں روانہ ہونے والے جہاز میں کسی طرح جگہ نہ مل سکی اور مجبوراً اگلے دن ۱۴ رجون کو دن کے جہاز سے دہلی پہنچنا ہوا، ہوائی اڈہ پر جامعہ ملیہ کے جو عزیز ملنے آئے ان کے مغموم چہرے غمازی کرتے تھے کہ واقعہ پیش آچکا ہے، لیکن نہ انہوں نے زبان سے کچھ کہا، نہ مجھے پوچھنے کی ہمت ہوئی، نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں ۲، ۳ گھنٹے ٹھہرنا ہوا، وہاں بھی زبانوں اور لبوں پر مہر لگی رہی، رات کی گاڑی سے لکھنؤ روانگی ہوئی، کانپور

www.abulhasanalinadwi.org

اسٹیشن پر بھی عزیز ملے لیکن وہاں بھی یہ راز افشا نہ ہوا، گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو ایک بڑا مجمع پلیٹ فارم پر موجود تھا، سوگوار اور غم میں ڈوبا ہوا، لیکن زبانیں بند، میں اس غیر معمولی مجمع ہی سے سمجھ گیا کہ اتنے سب دوست اسٹیشن پر کیوں آئے؟ سفر تو میری زندگی کا معمول بن گیا ہے اور میں ملک کے باہر بھی نہیں گیا تھا، لیکن زبان بے زبانی کہے دیتی تھی کہ واقعہ پیش آچکا ہے، پلیٹ فارم سے باہر آیا تو رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب گلوگیر اور مرتعش آواز میں واقعہ کی خبر دی اور میں اسی وقت موٹر سے رائے بریلی روانہ ہوگیا، یہ راستہ جس طرح گزرا اور وہاں جا کر جو کچھ پیش آیا، وہ الفاظ میں ادا کرنے کی چیز نہیں، بس اللہ سے دعاء ہے کہ پھر کبھی یہ آزمائش پیش نہ آئے۔

ان سطور کے لکھواتے وقت اچانک وہ دن یاد آگیا جب اکتوبر ۱۹۳۵ء کی کسی تاریخ کو بمبئی سے (جہاں بھائی صاحب مرحوم ہی نے ڈاکٹر امبیڈکر سے ملنے کے لئے بھیجا تھا) واپسی پر اچانک گھر میں محمد میاں کی ولادت کا مژدہ سننے میں آیا (۱) جو میرے پہنچنے سے دو چار دن پہلے کا واقعہ تھا، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے بھائی صاحب کو فرزند اور گھر کا چراغ عطا فرمایا تھا، اس پر گھر کے بچہ بچہ اور خاندان کے ایک ایک فرد کو جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لائے، بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''محمد کو لاؤ'' میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا، مولانا نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا، پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو ان کی مکتب نشینی کا وقت آگیا تھا، مولانا ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی، کیا عجب

(۱) ان کی ولادت ۱۷ رجب ۱۳۵۴ھ (۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی شامل رہی ہو۔

محمد میاں کی تعلیم کا قصہ بھی عجیب ہے، اگر بیان کرنے والوں پر اعتبار نہ ہو تو اس کا یقین کرنا مشکل ہے ع

حدیث گرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

ان کی تعلیم کا قصہ تفصیل کے ساتھ ان کے بڑے بھائی خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی حسنی سلمہ نے بیان کیا ہے، (۱) ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا، مختصر یہ کہ خاندانی دستور کے مطابق قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انہوں نے پہلے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی پڑھنے کے قابل ہوئے تو بھائی صاحب نے خود ہی ان کو پڑھانا شروع کیا، بھائی صاحب نے اگرچہ قدیم طرز کے مطابق عربی کی تعلیم حاصل کی تھی اور ماہر اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی تھی اور ہر فن میں ان کی استعداد پختہ تھی، لیکن میری اور محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں انھوں نے بالکل مجتہدانہ طریقہ اختیار کیا، میری تعلیم کے بارے میں کم لیکن محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں زیادہ، وہ اس بات کے قائل تھے اور ایک حد تک داعی اور مبلغ تھے کہ ابتداء میں زبان کی تعلیم صرف ونحو کے قواعد کی مدد کے بغیر دی جائے، گویا قیاس کے بجائے استقراء کے اصول پر، اور عربی کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کی جائے، عرصہ تک تو ایک گھر میں رہنے کے باوجود مجھے یہ خبر نہیں ہوئی کہ محمد میاں کیا پڑھ رہے ہیں، یہ زمانہ میری بحرانی تدریسی وتبلیغی مصروفیت کا تھا اور میں طویل طویل عرصہ تک سفر میں رہتا تھا، بھائی صاحب کی باقاعدہ تعلیم کے علاوہ محمد میاں میں اردو عربی کی ہر اس کتاب کے مطالعہ کا ذوق تھا جو ان کے ہاتھ لگ جائے، یہ ذوق ہم لوگوں میں موروثی طور پر لت اور مرض

(۱) ملاحظہ ہو تعمیر حیات کا خصوصی نمبر۔

www.abulhasanalinadwi.org

کی حد تک پہنچا ہوا ہے، ان کو عربی میں ابھی شد بد ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے ہر چیز کو پڑھنا شروع کر دیا، قدرتی طور پر ان کو زیادہ تر میری عربی تحریریں اور مضامین اور رسائل ملے اور انہوں نے اس کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ جذب کر لیا، اس بارے میں میرے ساتھ ان کا معاملہ وہی تھا جو میرا اپنے والد صاحب مرحوم کی تصنیفات اور تحریروں کے ساتھ تھا، کہ مجھے بچپن میں انہی کی چیزیں پڑھنے کو ملیں اور میں نے انہی کی طرزِ تحریر اور انشاء وادب کو معیاری ومثالی سمجھا، اسی کی تقلید میں فخر محسوس کیا، اور اسی کا چربہ اتارنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ خط سے خط ملانے کی کوشش بھی کی اور مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا، محمد میاں کا میری تحریروں کے ساتھ بھی یہی حال تھا کہ وہ ان کو پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ پی جاتے تھے اور اسی کے اسلوب کی تقلید کرتے تھے۔

ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے عربی کتنی پڑھ لی اور ان کی استعداد کیا ہوئی کہ ایک روز اچانک جب ان کی عمر ۱۳، ۱۴ سال سے زیادہ کی نہ ہوگی، انہوں نے شرماتے ہوئے مجھ سے اپنے عربی کے ایک مضمون کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میرے لئے یہ ایک انکشاف تھا کہ وہ عربی میں مضمون لکھنے لگے ہیں، میں نے بڑے شبہ واستعجاب کے ساتھ ان کا مضمون دیکھنا شروع کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کی عربی میں ان کا قلم چل گیا ہے اور وہ مضمون نگاری کے قابل ہو گئے ہیں، ۴۹ء میں جب ان کی عمر ۱۴، ۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، میں نے لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع میں ''صورت وحقیقت'' کے عنوان سے ایک تقریر کی، اس وقت کے حالات وتاثرات کی وجہ سے یہ تقریر بڑی مؤثر وطاقتور بن گئی تھی، بعض یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے میں نے اس کو اردو میں خود مرتب کیا، اور وہ ''صورت وحقیقت'' ہی کے عنوان سے چھپ گئی، اسی زمانہ میں مجھے حجاز کا دوسرا سفر درپیش تھا، جس میں مجھے وہاں طویل قیام

www.abulhasanalinadwi.org

کرنا تھا، اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں دینی و ذہنی تحریک پیدا کرنے کا عزم تھا، اس مقصد کے لئے مجھے ایسے دعوتی لٹریچر کی ضرورت تھی جو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل علم کے حلقوں میں ایک جنبش و تموج پیدا کر سکے، میں نے امتحاناً یہ تقریر محمد میاں کے حوالہ کی کہ وہ اس کا ترجمہ کر دیں، خیال تھا کہ میں اس پر محنت کر کے اس کو چھپنے کے قابل بنا دوں گا، لیکن جب وہ ترجمہ کر کے لائے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں اصل تقریر کا جوش اور طاقت موجود ہے اور مجھے اس پر کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں، یہ ان کے ترجمہ اور انشاء کا پہلا کامیاب تجربہ تھا ''بین الصورۃ والحقیقۃ'' کے نام سے یہ رسالہ عربی ٹائپ میں قیمہ پریس بمبئی میں چھپوا کر جون ۵۰ء میں اپنے ساتھ لے گیا، میں جتنے دعوتی رسائل اپنے ساتھ لے گیا تھا ان میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مؤثر و مقبول ہوا، اور بعض بڑے علماء نے اپنی مجلس میں اس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور وہ بہت سے عرب ممالک میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

کسی خاص محنت، کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم اور صرف و نحو اور مبادی کا ہفت خواں سر کئے بغیر محمد میاں کو عربی تحریر کا جو ملکہ حاصل ہو گیا اور وہ بے تکلف بڑے بڑے عرب ادباء اور اہل قلم کی کتابیں اور مضامین پڑھنے لگے، اس کو میں بھائی صاحب کی ایک کرامت ہی سمجھتا ہوں، انہوں نے اپنے کم سن یتیم بھائی (راقم السطور) کو جس خلوص، دلسوزی اور جانکاہی کے ساتھ عربی زبان و ادب اور دینیات کی تعلیم دلائی اور اس بارے میں اپنے والد ماجد کا منشا پورا کیا، جس طرح ہر فن کے ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا اور اس دور بینی اور بلند نگاہی کے ساتھ (جس کا ہندوستان کے حالات اور وقت کے دینی و علمی مشاغل سے کوئی جوڑ نہ تھا) اس کو عربی زبان میں دعوت و تبلیغ کے

www.abulhasanalinadwi.org

کام کے لئے تیار کیا، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا صلہ اور انعام محمد میاں کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کی ساری لیاقت وصلاحیت کا معاملہ محض وہبی اور خداداد تھا، اور ''عمل قلیلا و أجر کثیرا'' کا مصداق۔

ان کے میرے قلم سے قلم ملا دینے کی بات جب قلم کی زبان پر آ ہی گئی ہے تو یہ لطیفہ سناتا چلوں کہ ایک مرتبہ (غالباً ۵۵ء کی بات ہے) جب ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کی پہلی جلد لکھ رہا تھا اور مرکز دعوت وتبلیغ کچہری روڈ لکھنؤ میں، جہاں میرا قیام تھا، امام غزالیؒ کی ''إحیاء العلوم'' کی ایک طویل عبارت کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا، اس وقت محمد میاں کہیں سے آ نکلے، میں دیر سے ترجمہ میں مصروف تھا اور مجھے اٹھنے کی ضرورت تھی، میں نے ان سے کہا کہ ''یہاں سے تم ترجمہ کردو ابھی آتا ہوں'' انہوں نے قلم برداشتہ ترجمہ لکھنا شروع کردیا، میں جب فارغ ہوکر آیا تو وہ خاصہ حصہ لکھ چکے تھے، میں نے اس کے آگے سے لکھنا شروع کردیا، حصہ کو مکمل کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا تو مجھے قطعاً یہ پتہ نہیں چلا کہ میں نے کہاں سے شروع کیا تھا اور انہوں نے کہاں سے شروع کر کے ختم کیا، انہوں نے قلم سے قلم اور پیوند سے پیوند ایسا ملا دیا تھا کہ میں نہ ان کے اور اپنے خط میں، نہ زبان واسلوب میں امتیاز کرسکا، اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ پوری تحریر میرے ہی قلم کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ان کا ذہنی وادبی ارتقاء تیزی کے ساتھ جاری رہا، عمر ومطالعہ کے ساتھ اور جو حالات مشرق وسطیٰ میں پیش آرہے تھے، ان کے اثر سے ان کے قلم کی روانی اور اس سے بڑھ کر ان کے قلم کی طاقت اور جوشِ تحریر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ سچی بات ہے کہ وہ اس میں مجھ سے بازی لے گئے، ان میں فطری طور پر (اور کسی حد تک یہ بات موروثی بھی ہے کہ بھائی صاحب مقرر نہ تھے اور ان کی کم سخنی خاندان اور حلقہ میں

www.abulhasanalinadwi.org

ضرب المثل ہے) خطابت کا مادہ نہ تھا، خطابت کی یہ طاقت بھی زبان سے قلم ہی کی طرف منتقل ہوگئی اور ان کی عربی تحریر میں خطیبانہ جوش، بے ساختگی اور برجستگی اور آمد و روانی ایسی ہوگئی جو آتش نوا اور شعلہ بار خطیبوں کا شیوہ اور ان کی تقریروں کا خاصہ ہے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے میری بعض عربی تصنیفات کا ترجمہ کیا، دونوں زبانوں پر ان کو یکساں قدرت معلوم ہوتی ہے، لیکن خطابت اور جوش کا عنصر ان کی عربی تحریروں میں زیادہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو تحریر میں سلاست وحلاوت ان کو اپنے دادا (مولانا عبدالحیؒ) سے ورثہ میں ملی، میری کتاب ''الطریق إلی المدینة'' کا ترجمہ ''کاروان مدینہ'' ''الأرکان الأربعة'' کا ترجمہ ''ارکان اربعہ'' ''ربانیة لا رهبانیة'' کا ترجمہ ''تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک'' سب کے آخر میں ''السیرة النبویة'' کا ترجمہ ''نبی رحمت'' جو انہوں نے بڑے ذوق وشوق اور اہتمام واحترام کے ساتھ کیا، اس کے شاہد عادل ہیں۔

اسی زمانہ میں مشہور نومسلم، یہودی النسل، جرمن فاضل، علامہ محمد اسد کی کتاب ''Road To Macca'' کا عربی ترجمہ ''الطریق إلی مکہ'' سامنے آیا، میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا، کتاب نہایت فکر انگیز، خیال افروز بلکہ ایمان افروز تھی، لیکن وہ بڑی بلند پایہ، علمی وادبی زبان میں لکھی گئی تھی، اس میں کثرت سے نفسیات، فلسفۂ سیاسیات اور علم الاجتماع کی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں، مغربی بالخصوص امریکی مذاق کی رعایت سے مصنف نے اپنے تأثرات ومشاہدات اور اپنے فکر ومطالعہ کے نچوڑ کو اپنی زندگی کی ایک داستان کی شکل میں پیش کیا تھا، پھر اس داستان کو پڑھنے والوں کی دلچسپی کے خیال سے توڑ کر کتاب میں پھیلا دیا تھا اور ان کے مختلف ٹکڑوں کو آگے پیچھے کر دیا تھا، اس میں کسی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا تھا، میں نے پوری

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب پڑھ کر اور اس پر محنت کر کے اس کے ٹکڑوں کو تاریخی طور پر مرتب کر دیا، میں اس کتاب کے ترجمہ کو ذہین و اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم اہل فکر کے لئے (جو مسلمانوں کی کسی تحریر کو خاطر میں نہیں لاتے اور خاص طور پر دعوتی لٹریچر کو سطحی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں) بہت مفید سمجھتا تھا، لیکن مجھے اس بارے میں بڑا شک تھا کہ اس کے عربی ترجمہ کو جو مصنف کے زیر نگرانی ہوا ہے، اردو میں کوئی منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا، ہندوستان میں عربی کی ایسی بلند پایہ، عمیق و دقیق کتابیں (درسی، فقہی و کلامی کتابوں کو مستثنیٰ کر کے) کم ہی پہونچتی ہیں، اور ان کے پڑھنے والے تو خال خال ہی ہیں، میں نے بڑے تردد کے ساتھ یہ کتاب محمد میاں کو دی، میں نے کہا کہ اس کے ترجمہ کی کوشش کرو، انہوں انے انگریزی میں بھی استعداد پیدا کر لی تھی، میں نے کہا انگریزی اصل بھی سامنے رکھو اور جہاں دقت پیش آئے مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ سے مدد لو، انہوں نے کام شروع کر دیا، علمی اصطلاحات کے ترجمہ میں جہاں ان کو دقت پیش آئی انہوں نے مولانا سے رجوع کیا، مولانا نے فلسفہ کے مشہور فاضل و مصنف صاحبزادہ ظفر حسین خاں مصنف ''مآل ومشیت'' کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا، تھوڑے عرصہ میں انہوں نے ترجمہ مکمل کر دیا، جو ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے چھپا، یہ ترجمہ کسی طرح اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ یہ ایک ایسے نوعمر مترجم کے قلم سے نکلا ہے جس نے نہ کسی عربی مدرسہ میں تعلیم پائی، نہ کسی کالج میں، مصنف نے ازراہ کرم ہماری مجلس ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' ندوۃ العلماء لکھنؤ کو برصغیر ہندو پاکستان کے لئے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی اور اس کے یورپین ناشر سے بھی اجازت دلوادی، اس وقت سے اس برصغیر میں یہی ترجمہ چل رہا ہے، ہندی میں بھی اسی سے ترجمہ کیا گیا

www.abulhasanalinadwi.org

ہے، کتاب پڑھنے کے بعد کوئی انصاف پسند قاری ترجمہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہیں سے اس میں ترجمہ پن کی بو نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے قلم سے براہ راست یہ کتاب اردو میں نکلی ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ ترجمہ ان کے والد ماجد کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا اور انہوں نے اپنے لائق و ہونہار فرزند کی تحریری قابلیت اور ترجمہ کا کمال دیکھ لیا۔

ان کی اردو تحریر و انشاء اور تصنیف و تالیف کا ذکر شروع ہوا ہے تو اس کو مکمل کرتا چلوں کہ ۱۹۶۲ء میں طبیعت پر اس کا شدید تقاضا ہوا کہ بانیٔ ندوہ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی شایانِ شان سیرت و سوانح ندوۃ العلماء کی طرف سے مرتب کی جائے کہ یہ ایسے ادارے اور جماعت کا اخلاقی و علمی فرض ہے جو اُن کا لگایا ہوا قلم ہے، اور جس نے بڑی تعداد میں ایسے اہل قلم پیدا کئے، جنہوں نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کا میدان اختیار کیا اور اس میں اپنی کامیابی اور برتری کا نقش قائم کر دیا ہے، بہت سی حیثیتوں سے یہ میرا فرض تھا کہ میرے قلم سے متعدد سوانح عمریاں نکل چکی تھیں، لیکن اس زمانہ میں میری نظر بہت کمزور تھی اور نزول الماء کی وجہ سے میں ایسا تصنیفی کام کرنے سے قاصر تھا جس میں کثرت سے باریک تحریروں کو پڑھنا اور مواد اور حوالے تلاش کرنا ضروری ہے، میری نظر ہندوستان کے بعض اچھے اہل قلم پر پڑی جن کو دینی شخصیتوں کی سوانح نگاری سے خاص مذاق اور شغف تھا، میں نے ان سے خط و کتابت بھی کی، لیکن کام شروع نہ ہوسکا، پھر اس غرض سے دارالعلوم کی بالائی عمارت میں اس سوانح کی ترتیب و تحریر کے لئے باقاعدہ دفتر قائم کیا، دارالعلوم کے ایک اہل قلم استاد کی خدمات بھی اس کے لئے لیں اور کتاب کا مواد، ماخذ اور ضروری کتابیں جمع کر دیں، لیکن کام میں کچھ پیش رفت نہیں ہوئی، اسی دوران ایک روز

www.abulhasanalinadwi.org

اچانک معلوم ہوا کہ محمد میاں (جن کا ''البعث الاسلامی'' کا دفتر اسی کمرہ میں تھا) بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کر چکے ہیں اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، یہ غالباً اس تعلق کا نتیجہ تھا جو ان کے دادا مولانا حکیم عبدالحی صاحبؒ اور حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیریؒ کے درمیان رہ چکا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح اور سیرت کی تصنیف و ترتیب میں ملحوظ رکھنے چاہئے،

مکتبۃ العلامۃ ... الحسنی
٨٩٥
١١٣٥٠

تھوڑے عرصہ میں انہوں نے سوانح کا مسودہ میرے حوالہ کیا کہ میں اس پر اصلاحی نظر ڈالوں، کتاب میرے تصور و توقع سے بلند نکلی، مجھے آج بھی اس میں بہت شبہ ہے کہ میں اس کو اتنے اچھے طریقہ پر لکھ سکتا اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا؟ کتاب میں ان کے قلم کی پختگی کے ساتھ ان کے ذہنی بلوغ اور پختگی کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے مصنف کے قلم سے نکلی ہے جس کی عمر صرف ۲۵ سال ہے اور جس نے کسی تصنیفی ادارہ یا کسی استاد سے تصنیف و تالیف کی تربیت نہیں حاصل کی، کتاب میں متانت تحریر، توازن اور اسی کے ساتھ ادبیت و تاثیر ہے، اور وہ سیر و سوانح کی ان شرائط کو پورا کرتی ہے جو ایک جامع کمالات ہستی اور ایک عہد آفریں تحریر کے بانی کی سوانح کے لئے ضروری ہیں۔

۳۱؍ اکتوبر، ۱، ۲، ۳؍ نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع احاطہ میں منعقد ہوا، شرکائے اجلاس کے مرتبہ و مقام، مؤقر عرب وفود کی کثرت، عرب ممالک کی سربرآوردہ علمی و دینی شخصیتوں کی موجودگی، شیخ الازہر علامہ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود صدر اجلاس کی دلآویز شخصیت اور ان کی اقتداء میں

www.abulhasanalinadwi.org

جمعہ کی نماز کی ادائیگی، (جس میں ایک لاکھ سے زائد کے مجمع کا اندازہ کیا جاتا ہے) اجلاس کے دوران سکینت وبرکت کی ایک روحانی فضا کا احساس، جلسوں کا نظم وضبط، حاضرین کا گہرا تأثر، یہ سب وہ خصوصیات تھیں جو ہندوستان کی تاریخ میں اس سرزمین پر مدت دراز سے دیکھنے میں نہیں آئی ہوں گی، لیکن جو لوگ اس جشن میں شریک نہیں تھے ان کو جشن کا صحیح تأثر دینا اور اس کی قلمی تصویر کھینچنا اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار معلوم ہوتا تھا ؎

گر مصور صورت آن دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش راچساں خواہد کشید

لیکن اس جشن کی روداد کا مرتب نہ کرنا اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو دوسروں کو دکھانے کی کوشش نہ کرنا بھی سمجھ میں نہ آیا، آخر میں محمد میاں ہی پر نظر پڑی کہ وہ اس میں عملاً شریک بھی تھے اور ان احساسات وجذبات میں بھی ان کا حصہ تھا جو اس اجلاس کے پیچھے کام کر رہے تھے، یہ ان کے گھر کی کہانی تھی اور ان کے دادا اور باپ کے خون اور پسینے سے سینچے ہوئے پودے کی نکھار اور فصلِ بہار کی داستان اور بقول شاعر ؎

داستانِ فصل گل خوش می سراید عندلیب!

انہوں نے میرے عربی خطبۂ استقبالیہ کا ترجمہ اردو میں اس طرح کیا تھا کہ بعض جگہ وہ عربی سے بھی بڑھ گیا تھا، شعر کی جگہ شعر رکھنا اور ہندوستانی ومقامی ماحول کی رعایت سے الفاظ کا انتخاب، بڑی سبک دستی بلکہ چابکدستی کا کام تھا، انہوں نے روداد مرتب کی اور گویا الفاظ میں ریکارڈنگ کا کام اس طرح کیا کہ پڑھنے والے کو دل کی دھڑکنیں، ذہن کے اندیشے، انبساط کی کیفیت اور سانس کی آواز بھی سنائی دے، جب یہ ''رودادِ چمن'' کے نام سے شائع ہوئی تو مخدومی مولانا عبد الماجد صاحب

www.abulhasanalinadwi.org

دریابادی علیل اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے، انہوں نے کتابوں پر مختصر تبصرہ کیا جو عرصہ سے انہوں نے کسی کتاب پر نہیں کیا تھا، ان کا جملہ بڑا معنی خیز اور پوری عبارت کا قائم مقام ہے کہ ''مصنف نے پروپیگنڈہ کو لٹریچر بنادیا ہے'' آج بھی کتاب موجود ہے اور اس میں مصنف کے قلم کی مصوری کا کمال دیکھا جاسکتا ہے۔

گھر کے ماحول، خاندانی اثرات اور فطرت سلیمہ کی بناء پر محمد میاں کی اہل قلوب اور خاصانِ خدا سے گہری عقیدت تھی اور وہ تزکیۂ نفس اور تعلق مع اللہ کی اہمیت و ضرورت سمجھتے تھے، اسی جذبہ نے اس زمانہ میں جب وہ اپنے علمی و ادبی مشاغل میں منہمک تھے، ان کے قلم سے اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شہید احمد شہیدؒ کے جدامجد اور گیارہوں صدی ہجری کے ممتاز ترین متبع سنت و حامی شریعت شیخ حضرت سید شاہ علم اللہؒ کی سیرت لکھوائی، جو جولائی ۱۹۷۰ء میں ''تذکرۂ حضرت سید شاہ علم اللہؒ'' کے نام سے شائع ہوئی، وہ ان کی مؤثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ ان کے گویا خاندانی شیخ تھے، اور ان کے والد والدہ دونوں ان سے بیعت تھے، مولانا لکھنؤ میں بھائی صاحب کے گھر کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے جو تعلقِ خاص تھا اس کی بنا پر محمد میاں پر بھی بڑی شفقت کی نظر تھی، مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۵۷ء میں بھائی صاحب مولانا کی عیادت کو دیوبند تشریف لے گئے تو میں اور محمد میاں بھی ہمرکاب تھے، ایک دن مولانا نے مجھ سے پوچھا ''محمد میاں کیا کرتے ہیں؟'' میں نے کہا کہ عربی کا رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے ایڈیٹر ہیں، فرمایا کہ ''آپ ان کو دارالعلوم کا کوئی سبق نہیں دیتے'' میں نے بعض مصالح کا ذکر کیا جو اس کے منافی تھے، فرمایا کہ ''کیا آپ لوگوں کے کہنے سننے کا خیال کرتے ہیں؟'' پھر عربی کے دو شعر پڑھ کر جن کا مطلب یہ تھا کہ زبان خلق سے تو کوئی بڑی

www.abulhasanalinadwi.org

ہستی بھی محفوظ نہیں رہی، فرمایا کہ ''ان کو دارالعلوم سے جو قلبی لگاؤ اور اس کے کاموں میں دلسوزی و دلچسپی ہوگی وہ ہر ایک کو تو نہیں ہوسکتی۔''

اس عقیدت کا نتیجہ تھا کہ محمد میاں نے مولانا کی سیرت لکھنے کا ارادہ کیا جو مولانا کے حلقۂ عقیدت بلکہ ہندوستان کی ملت اسلامی کے ذمہ قرض ہے، جس کے لئے انہوں نے قربانیاں دیں، انہوں نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا، لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے وہ مکمل نہ ہوسکا۔

اپنے زمانہ کے شیوخ وصلحاء میں ان کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بڑی عقیدت تھی، حضرت کی لکھنؤ کی مجلسوں میں تو وہ شریک ہوتے ہی تھے، رائے پوریؒ بھی گئے اور وہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت کی آخری علالت میں ان کو لاہور پہنچادیا، حضرت کا حادثۂ وفات ان کے سامنے ہی پیش آیا، جنازہ کے ساتھ گئے اور حضرت کے وطن ڈھڈیاں جاکر تدفین میں شرکت کی۔

اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ سے بھی عقیدت ومحبت تھی، متعدد بار وہ رمضان المبارک میں سہارنپور جاکر ان کی صحبت اور ان کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے، حضرت شیخ کی مشہور کتاب ''فضائل نماز'' کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو ''الصلوۃ ومکانتھا في الاسلام'' کے نام سے چھپی ہے، جس سے حضرت کی دعائیں ان کو حاصل ہوئیں اور تبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، آخری دور میں ان کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری سے بڑا تعلق ہوگیا تھا اور مولانا کی بھی ان پر خصوصی نگاہِ شفقت تھی، مولانا کے عارفانہ کلام کو جمع ومرتب کرنے میں خاص طور پر ان کی تحریک شامل تھی اور انہی کے بار بار تقاضے سے ''دیوانِ محبت'' کے نام سے مجموعہ مرتب ہوا جس کے عناوین انہی کے

www.abulhasanalinadwi.org

تجویز کئے ہوئے ہیں، مولانا کی خدمت میں وہ وقتاً فوقتاً حاضر بھی ہوا کرتے تھے، مولانا کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔

محمد میاں پڑھنے لکھنے میں جتنے پکّے تھے، سفر میں اتنے ہی کچّے تھے، یہ وراثت ان کو اپنے والد ماجد سے ملی تھی جو برسوں سفر نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ والدہ صاحبہ کے اشارہ و ہدایت سے میں ان کو مسلم مجلس مشاورت کے دورۂ گجرات میں ساتھ لے گیا جو دسمبر ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا، اس سلسلہ میں احمد آباد اور اس کے نواح گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھروچ ان کا جانا ہوا، حجاز کے سفر بھی انھوں نے میرے دوسرے عزیزوں اور رفیقوں کے مقابلہ میں کم کئے تھے، پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء کو انھوں نے حجاز کا سفر کیا تھا اور وہاں چھ مہینے قیام کر کے واپس ہوئے تھے، دوسرا سفر انھوں نے تنہا ۱۹۷۲ء میں ''الندوة العالمية للشباب الإسلامي'' کی دعوت پر، جس کا مرکز ریاض میں ہے، کیا، اور سالانہ کانفرنس میں شرکت اور حج سے فراغت کر کے واپس ہو گئے، تیسرا سفر ۱۹۷۴ء میں میری معیت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری کے موقع پر پیش آیا، ہوائی جہاز کے سفر سے ان کے اعصاب پر بڑا اثر پڑتا تھا، اور وہ سفر میں ٹرین کو ترجیح دیتے تھے لیکن بیرونی ممالک کے سفر میں ہوائی جہاز سے چارہ نہیں تھا اس لئے وہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، انتقال سے کچھ ہی دن پہلے ان کو ایک طرف قبرص (سائپرس) کی مسلم صحافت کی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے جو رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام میں ہو رہی تھی، دعوت نامہ ملا، اور دوسری طرف ماسکو کی ایک صحافتی کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت نامہ آیا ہوا رکھا تھا، لیکن انھوں نے ان دونوں سفروں میں سے کسی میں جانا پسند نہیں کیا اور اس کی نوبت آنے سے پہلے وہ دنیا سے سفر کر گئے، قبرص میں بجائے ان کی موجودگی کے ان

www.abulhasanalinadwi.org

کے لئے دعائے مغفرت کی گئی اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچایا گیا۔

۶/۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے کراچی میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، اس وقت میں حجاز میں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ محمد میاں کے نام بھی دعوت نامہ گیا ہے، میری بڑی خواہش تھی اور میں نے اس کے لئے حرم شریف میں دعا کی کہ وہ اس کی شرکت کے لئے آمادہ ہو جائیں اور پاکستان کے سفر و قیام میں ان کا ساتھ ہو، اللہ نے یہ دعا قبول کی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کی معیت میں وہ عین وقت پر پہنچ گئے، اس کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ میرے ساتھ پاکستان کے مختصر دورے میں شریک رہے، فیصل آباد، اسلام آباد، راولپنڈی، سرگودھا، اکوڑہ خٹک اور لاہور کے سفر میں ساتھ رہا، اس سفر میں وہ اپنے مرشد حضرت مولانا رائے پوریؒ کے وطن و مدفن دھڈیاں بھی گئے، دو دن وہاں قیام رہا، ہندوستان آکر انھوں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ یہی سفر کا حاصل تھا، اور جو سکون وہاں نصیب ہوا پورے سفر میں نصیب نہیں ہوا، اس موقع سے ان کو دور افتادہ عزیزوں نے بھی دیکھ لیا، جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں تھا اور ان کا نام اور قابلیت کی شہرت سنتے تھے،.... انھوں نے اس پورے سفر میں اپنے کو ایک معمولی رفیق اور شریک قافلہ سے زیادہ نہیں سمجھا اور ہر جگہ چھوٹے بن کر رہے۔

ان کا ذہنی و علمی نشو ونما دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول میں ہوا تھا، ان کا رابطہ وہاں کے اساتذہ اور فضلاء سے مسلسل اور مستقل طور پر رہا، آمد و رفت، مجالس کی شرکت اور علمی مذاکرات کے ذریعہ وہ وہاں کے ماحول اور فضا سے قریب رہے، ندوہ سے ان کو دو یا تین پشتوں کا تعلق تھا، وہ اس کے مقاصد اور دعوت کے بچپن سے آشنا اور مانوس تھے پھر ان کا مطالعہ جتنا بڑھتا گیا اس پر ان کا اذعان اور اس کی صحت و

www.abulhasanalinadwi.org

صداقت پر یقین بھی بڑھتا گیا جس کا اندازہ ان کے ان اردو اور عربی مضامین سے ہوتا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً ندوۃ العلماء کے ترجمان ''تعمیر حیات'' اور ''البعث الاسلامی'' میں لکھتے رہے، نیز ان مضامین ورسائل سے جو انھوں نے پچاسی سالہ تعلیمی جشن کے لئے لکھے، اس آزاد علمی استفادہ کے علاوہ انہوں نے مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم شیخ الحدیث دارالعلوم کے درسِ حدیث میں سال بھر باقاعدہ شرکت کی اور ان سے صحاح کا درس لیا۔(۱)

محمد میاں کا ذہن شروع سے وسیع تھا، ان میں کہیں سے سید جمال الدین افغانی کے آتش کدہ کی ایک چنگاری اڑ کر آ گئی تھی جو ان کو بے چین بنانے اور وسیع خطوط پر سوچنے پر مجبور کرتی تھی، انہوں نے ہندوستان سے تو کیا اپنے شہر لکھنؤ سے بھی بہت کم باہر قدم نکالا تھا، ان کے سفروں کی حد یہی دو تین قریبی اضلاع تھے، جن سے ان کو وطنیت یا قرب کا تعلق تھا، لیکن وہ لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے عالم اسلام کے اسلام پسند اور حوصلہ مند نوجوانوں کی تنظیم کے خواب دیکھتے تھے، رجب ۱۳۷۹ھ (جنوری ۱۹۶۰ء) میں انہوں نے اپنے رسالہ ''البعث الاسلامی'' میں سال نو کے تحفہ کے طور پر اس تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی، پھر اگلے شمارہ شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں ''مشروع اسلامی کبیر'' کے عنوان سے انھوں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور نوجوانوں کو اس کی رکنیت کی دعوت دی، عربی میں اس کا نام ''جمعیة الرابطة الإسلامية'' تھا اور انگریزی میں ''International Cultural Islamic Organization'' یہ نوجوانوں کی بین الاقوامی اسلامی تنظیم تھی جس کا مقصد آپس میں تعارف، ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت، مسلمانوں میں

(۱) اس درس میں مولوی ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری (حال مستشار علمی رئیس القضاۃ (ابوظبی) ان کے رفیق و شریک تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بیداری پیدا کرنے کے کام میں تعاون، ان کو صحیح مشورہ اور رہنمائی پیش کرنا تھا، اس کی طرف سے عربی انگریزی میں رسائل و مضامین بھی شائع ہوئے اور وہ دوسرے ملکوں تک پہنچے، بہت سے نوجوانوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور رکنیت قبول کی، یاد رہے کہ یہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے قیام سے دو سال پہلے کی بات ہے۔

اردو تحریر و تصنیف اور ان کے سفروں اور بعض دعوتی و تنظیمی کاموں کے اس ضمنی تذکرہ کے بعد جو محمد میاں کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کاموں میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، ہم ان کی عربی تحریر و انشاء کی طرف واپس آتے ہیں کہ یہی ان کا اصل میدان اور ان کے تفوق و امتیاز کا نشان ہے، عربی میں ان کا زورِ قلم بڑھتا رہا اور ان کو اپنی تحریر و انشاء کے لئے ایک نئے اور مستقل میدان کی ضرورت جلد پیش آ گئی، وہ بڑے سے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھ لیتے تھے، ان کے مضامین و تحریر میں آمد ہی آمد تھی، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں نے کچھ لکھنا چاہا لیکن لکھنے کا موڈ نہ تھا، بعض کہنہ مشق اساتذۂ ادب اور عربی لکھنے والوں کے سپرد کیا تو مطلب کی بات ادا نہ ہوئی مجبور ہو کر میں نے ان کے حوالہ کیا اور وہ تھوڑے وقت میں قلم برداشتہ لکھ کر لے آئے اور میں اس کو پڑھ کر بالکل مطمئن کہ میری صحیح ترجمانی اور مضمون کا حق ادا ہو گیا، بعض نہایت نازک اور ذمہ دارانہ موقعوں پر مثلاً ۲۲/اپریل ۷۴ء کو سعودی سفیر ہز اکسلینسی انس یوسف یاسین کی آمد اور ۳/فروری ۷۸ء کو امام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن کی تشریف آوری اور نماز جمعہ کی امامت کے موقعہ پر ندوۃ العلماء کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ انھیں کا لکھا ہوا تھا، حقیقت میں یہ کام میرے کرنے کا تھا لیکن وقت کم تھا اور طبیعت مضمحل وہ دن گذر چکے تھے جب طبیعت جوش سے بھری ہوئی اور قلم کی کمان چڑھی ہوئی تھی، میں نے کہا کہ ''محمد میاں! یہ سپاسنامہ تم

www.abulhasanalinadwi.org

لکھو' ان میں سعادتمندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور میرے ساتھ معاملہ تو ایک سعید فرزند کا تھا، طبیعت شگفتہ تھی یا افسردہ، وہ گئے اور اس طرح مضمون لکھ کر لے آئے کہ جیسے کمپیوٹر میں سے کوئی چیز نکل آئے، دیکھا تو اول سے آخر تک مرصع، کہیں قلم رکھنے کی گنجائش نہیں، پھر زور بیان، برجستگی اور دلآویزی مستزاد، پڑھ کر دل خوش ہو گیا اور دل سے دعاء نکلی، مضمون علماء و ادباء کی موجودگی میں جلسہ میں پڑھا گیا اور سب نے داد دی، ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد رہی ہوگی جو سمجھتے ہوں گے کہ میں نے لکھا ہے، میں نے ایک فاضل دوست سے سنا ہے کہ جب ''البعث الاسلامی'' کے آتشیں اور شعلہ بار اداریئے ان کے نام سے چھپے ہوئے بعض اہل ذوق نے پڑھے تو کہا کہ'' یہ سب مولانا ابوالحسن علی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، محمد میاں کا نام ہوتا ہے۔''

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مجھے اپنی کتاب ''الصراع بین الفکرۃ الإسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ'' کے نئے ایڈیشن کے لئے آخری مضمون لکھنا تھا جس میں پوری کتاب کا عطر آجائے اور وہ پڑھنے والے میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا کردے، کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا تھا، ادھر مجھ سے بعض اہل ذوق نے یہ کہا تھا کہ کتاب کا آخری مضمون پوری کتاب کے مقابلہ میں کسی قدر سست اور ڈھیلا ہے، اور ناظرین وہی تأثر لے کر کتاب بند کرتے ہیں جو اس کے آخری باب یا فصل سے ان پر طاری ہوتا ہے، میں نے کچھ دیر تو سوچا کہ میں عربی میں لکھوں یا اردو میں؟ پھر فیصلہ کیا کہ اردو میں لکھوں، اتفاق سے اسی زمانہ میں پاکستان کے ایک مؤقر دینی رسالہ کے مدیر(۱) کی (جو مجھے بہت عزیز ہیں) فرمائش آئی ہوئی تھی کہ میں ان کے رسالہ کے لئے کوئی مضمون بھیجوں، میں نے سوچا کہ ''بیک کرشمہ دو کار'' میں یہ

(۱) مولانا سمیع الحق صاحب مدیر رسالہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک ضلع پشاور۔

www.abulhasanalinadwi.org

مضمون بھی ان کو بھیج دوں گا اور اس کو خود عربی میں منتقل کر دوں گا، طبیعت موڈ پر تھی اور کتاب کے مؤثر و نتیجہ خیز بنانے کا عزم تھا اس لئے طبیعت میں آمد ہوئی اور میں نے ایک نشست میں پورا مضمون لکھوا دیا، جو ''حرف آخر'' کے عنوان سے اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں نظر آئے گا، مضمون سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب عربی میں اس کے لکھنے میں وہ آمد اور زور نہیں رہے گا جو براہ راست مضمون کے لکھنے میں تھا، اتفاق سے محمد میاں رائے بریلی آئے، میں جانتا تھا کہ ماشاء اللہ ان کی کمان چڑھی رہتی ہے اور ان کا اشہب قلم ساز و یراق سے آراستہ رہتا ہے، میں نے کہا کہ محمد میاں اس کے عربی ترجمہ کی کوشش کرو، مجھے خود یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے، میرے ایک دو مرتبہ کہنے کے بعد وہ گھر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مضمون لکھ کر لے آئے، دیکھا تو معلوم ہوا کہ جیسے کسی عمدہ مشین سے ڈھلا ڈھلایا نکلا ہو، جہاں تک یاد ہے کہیں انگلی رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، عربی کتاب ''الصراع بین الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية'' میں یہ مضمون ''خاتمة البحث'' کے عنوان سے موجود ہے، مترجم کا نام کتاب میں نہیں ہے، جس کا جی چاہے پڑھ لے، اور فیصلہ کرے کہ کیا کتاب میں دو قلم ہیں، یا ایک ہی؟ بلکہ بہت سے اہل ذوق محسوس کریں گے کہ یہ کتاب کا سب سے طاقتور حصہ ہے اور کتاب کی روح سمٹ کر اس میں آ گئی ہے۔

اس پر ایک دوسرا واقعہ یاد آیا انھوں نے ''الإسلام بين لاونعم'' (جواب ان کے ایک پورے مجموعہ مضامین کا نام ہے) کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس تضاد کا اظہار کیا تھا جس کو مسلمان حکومتیں معاشرے اور افراد اسلام کے بارے میں اختیار کئے ہوئے ہیں، مضمون میں انھوں نے حسب معمول اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، غالباً ۶۳ء یا ۶۴ء تھا، میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کے سلسلہ

www.abulhasanalinadwi.org

میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا، مصر اور تحریک اخوان کے مشہور خطیب و ادیب استاد عبدالحکیم عابدین جو بانی تحریک ''الإخوان المسلمون'' الامام الشہید حسن البناء کے بہنوئی اور ایک زمانہ میں جماعت ''الإخوان المسلمون'' کے سکریٹری جنرل بھی رہے اور مصر سے جلاوطنی کے بعد بیروت میں وکالت کرتے تھے، مجھ سے ملنے عزیزی ڈاکٹر مولوی عبد اللہ عباس ندوی کے مکان پر آئے، کسی ضرورت سے کمرہ سے باہر گیا، واپس آیا تو دیکھا کہ وہ ''الإسلام بين لا ونعم'' پڑھ رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے ہیں، میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے روتے ہوئے کہا ''من هذا الأخ الذي كتب هذا المقال ؟'' (یہ کون صاحب ہیں! جنھوں نے یہ مضمون لکھا ہے؟) میں نے کہا کہ میرے بھتیجے ہیں، رو کر کہنے لگے کہ ''میرا اسلام پہنچانا اور مضمون کی داد دینا۔''

۱۹۵۲ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور زمامِ اختیار و قیادت صدر ناصر کے ہاتھ آئی اور ''قومیت عربیہ'' کی وہ تیز و تند آندھی اٹھی جو عرب نوجوانوں بلکہ پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اڑا لے گئی، بڑے بڑے تناور درخت اور علم و ادب کی کوہ پیکر شخصیتیں اس طوفان میں پتہ کی طرح اڑتی اور اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہتی نظر آتی تھیں، اس وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کی ترجمانی کے لئے عربی کا ایک رسالہ نکالا جائے، اس وقت اس پورے تحتی براعظم میں عربی کا کوئی رسالہ نہ تھا، ندوۃ العلماء کا آرگن ''الضیاء'' ۱۹۳۵ء ہی میں بند ہو گیا تھا، عربی صحافت کا مزاج ایسا بگڑا تھا کہ جو لوگ اس فتنۂ عالم آشوب سے متاثر نہیں تھے اور ''قومیت عربیہ'' اور مصری قیادت پر تنقید کرنا چاہتے تھے، ان کے مضامین کا کسی اخبار و رسالہ میں چھپنا بھی دشوار تھا، اور اگر وہ کہیں چھپتے تو یہ رسائل ان غضبناک

www.abulhasanalinadwi.org

نوجوانوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتے جو اس فلسفہ پر ایمان لا چکے تھے اور جن پر قومیت واشتراکیت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء میں جب یہ تحریک اپنے شباب پر تھی اور سارا مشرق وسطی (الا ماشاء اللہ) اس نشہ سے مست اور اپنے جامہ سے باہر ہو رہا تھا، ہم لوگوں نے عربی رسالہ کے اجراء کا ارادہ کیا، اس سے کچھ پیشتر محمد میاں کا ایک مضمون رسالہ ''المسلمون'' میں ''العالم الإسلامی علی مفترق الطرق'' (دنیائے اسلام دوراہے پر) کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ''المسلمون'' اپنے عہد کا معیاری اور صف اول کا عربی رسالہ اور فکر و دعوت اسلامی کا بین الاقوامی ترجمان تھا، جس میں عالم عربی اور دنیائے اسلام کے چیدہ و برگزیدہ اہل قلم وارباب قلم لکھتے تھے، اس بلند پایہ رسالہ میں لکھنا ہر ایک کا کام نہ تھا، اس وقت صاحب مقالہ کی عمر ۲۰ سال سے بھی زیادہ نہ تھی، رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سعید رمضان اس وقت تک ہندوستان نہیں آئے تھے، وہ بالکل نہیں سمجھ سکے کہ مضمون نگار عربی کا ایک نوعمر لکھنے والا ہے جو جلد اسلامی عربی صحافت کے افق پر ستارہ بن کر چمکنے والا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ''البعث الإسلامی'' کے نام سے یہ رسالہ نکلا، اس کے مدیر، مالک، سب کچھ محمد میاں ہی تھے، بھائی صاحب مرحوم نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی، محمد میاں کے دوست اور دارالعلوم کے لائق استاد مولوی سعید الرحمٰن ندوی ان کے معاون خاص تھے۔

خوش قسمتی سے اس رسالہ کو اسی حسنی گھرانے کے دو اور لائق فرزند محمد میاں کے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولوی سید محمد واضح رشید ندوی کا قلمی تعاون بھی حاصل ہو گیا، یہ دونوں بھائی (اللہ ان کی عمر میں برکت دے) عربی

www.abulhasanalinadwi.org

صحافت کی ممتاز صلاحیت رکھنے کے ساتھ انھیں جذبات وخیالات سے سرشار تھے جو محمد میاں کے سینہ میں موجزن تھے، ان چاروں نے ایک ٹیم کی طرح کام کیا اور رسالہ کو تیزی کے ساتھ ترقی دی، جب رسالہ کی افادیت ومقبولیت نمایاں ہوئی تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے (۱۹۶۰ء میں) اس کو ندوۃ العلماء کے ترجمان کی حیثیت سے لینے کا فیصلہ کیا اور بھائی صاحب مرحوم کی فراخ دلی اور محمد میاں کے ایثار سے یہ رسالہ ندوۃ العلماء کی طرف سے خوبصورت ٹائپ میں چھپنے لگا، پہلا شمارہ جو ندوۃ العلماء کی جانب سے نکلا اور جس پر ''تصدر ھا ندوۃ العلماء'' لکھا ہوا ہے، وہ رمضان وشوال ۱۳۷۹ھ (مارچ واپریل ۱۹۶۰ء) کا پرچہ ہے، اسی کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۹ء سے ایک پندرہ روزہ اخبار ''الرائد'' بھی نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر خصوصی مولوی محمد رابع ندوی، شریک ادارت مولوی محمد واضح رشید ندوی تھے اور خصوصی مضمون نگار محمد میاں، اس اخبار نے رسالہ کو کمک پہنچائی اور دونوں نے مل کر صحیح خیالات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

''البعث'' نے ایک ایسی حکومت، دعوت اور تحریک کے خلاف محاذ کھول دیا جو عصر حاضر کی ان تمام طاقتوں سے مسلح تھی جو کسی بڑی حکومت، وسیع ملک اور شاطر قیادت کو حاصل ہوتی ہیں، کہاں مصر کا سحر سامری اور دبدبۂ فرعونی، جس کے جلو میں صحافیوں، ادیبوں، خطیبوں، مصنفین، اہل قلم کا لشکر اور ذرائع ابلاغ کے زبردست مرکز تھے، جنھوں نے اچھی اچھی مخالف عرب حکومتوں کے چھکے چھڑا رکھے تھے، کہاں محدود تعداد میں معمولی ٹائپ وکاغذ پر چھپنے والا عربی کا یہ غریب رسالہ، جس کے عملہ کا حال یہ تھا کہ ع

خود کوزہ و خود گر و خود گل کوزہ

لیکن اس کے صاحبِ ایمان نوجوان مدیر کا جوشِ جنوں، ان کی غیرتِ ایمانی اور

www.abulhasanalinadwi.org

زورِ قلم کی وجہ سے، جس نے سید جمال الدین افغانی کے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے مخصوص مقالات اور مولانا آزاد کے ''الہلال'' کے آتشیں اداریوں کی یاد تازہ کردی تھی، بہت جلد اس رسالہ نے اسلام پسند حلقوں میں جو مصر کی اس ''خانہ برانداز'' تحریک سے بے چینی محسوس کرتے تھے لیکن کھل کر اپنی بیزاری کا اظہار اور مصر کی قیادت پر تنقید نہیں کر سکتے تھے، مقبولیت حاصل کر لی اور انہوں نے اس کو نہ صرف اپنے خیالات کا ترجمان سمجھا بلکہ اپنے زخموں کا مرہم اور اپنے درد کی دوا سمجھے، اس کا اندازہ ان تعزیتی خطوط اور تعزیتی نوٹس سے ہوگا جو عالم عربی کے بلند پایہ اسلامی الفکر صحافیوں، عالموں، ادیبوں اور رہنماؤں نے اس جواں سال مسلم صحافی کی وفات پر لکھے اور جن کے متعدد نمونے مرحوم کے تازہ مجموعۂ مضامین ''تناقض تحار فيه العيون'' کے آخر میں شائع ہوئے ہیں۔

''البعث'' کے اداریوں اور مقالات کی گونج صرف اسلامی ہی حلقوں میں نہیں سنی گئی بلکہ مصر و شام کے ادبی صحافی حلقوں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی سنی گئی، مجھے ایک باخبر معتبر مصری دوست نے بتایا کہ صدر ناصر کو جو چند رسائل اور اخبارات کے تراشے مطالعہ کے لئے پیش کئے جاتے تھے، ان میں ''البعث الإسلامي'' بھی ہوتا تھا، ہندوستان کے مصری سفارتخانوں نے حکومت ہند سے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا اور ایڈیٹر سے جواب طلبی بھی ہوئی، لیکن انھوں نے اپنی روش نہیں چھوڑی اور ان کے زورِ قلم میں کوئی کمی نہیں آئی، راقم السطور سے مشہور عرب رہنما اور مجاہد شیخ محمد محمود الصواف (رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی) نے خود ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''البعث الاسلامی'' نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ پورے عالم عربی میں کسی رسالہ یا اخبار سے نہیں ہو سکا۔

''البعث الإسلامي'' کی مقبولیت اسلامی حلقوں میں برابر بڑھتی گئی،

www.abulhasanalinadwi.org

سعودی عرب نے، جو ملک فیصل مرحوم کی قیادت میں مصر کی اس تحریک کا خاص طور پر مقابلہ کر رہا تھا، خاص طور پر اس کی اہمیت محسوس کی اور وہاں کے بعض صاحب حمیت عالموں اور شیوخ نے ''حسبة للّٰه'' اس کی تبلیغ واشاعت کا کام کیا، مجھے یاد ہے کہ محمد میاں جب پہلی مرتبہ (۱۳۸۷ھ، ۱۹۶۷ء میں) میرے ساتھ حجاز گئے اور وہاں کے وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن بن عبداللہ بن حسن سے ملنے کے لئے ہم لوگ شیخ محمد محمود الصواف کی معیت میں طائف گئے تو انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ''البعث'' کے جوان مدیر کا استقبال کیا اور رسالہ سے اپنی گہری دلچسپی وتأثر کا اظہار کیا۔

اسی سفر میں (۱۳ رجب ۱۳۸۷ھ، ۱۶/اکتوبر ۱۹۶۷ء کو) وہ سنگین حادثہ پیش آیا جس میں اللہ نے ہم دونوں کو بال بال بچایا، ہوا یہ کہ جب ہم طائف سے واپس آرہے تھے تو حدود مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی او ایسی الٹی کی چھت بالکل زمین پر تھی اور چاروں پہیے دفتی کے ڈبہ کی طرح اوپر، ڈرائیور کا خیال تھا کہ ہم دونوں اب اس عالم میں نہیں ہیں، اس نے لیٹے لیٹے پوچھا ''یاشیخ أأنت حيّ'' واقعہ بھی ایسا تھا، گاڑی جب رکی تو پہلے محمد میاں باہر آئے اور انھوں نے کہا کہ چچا میاں باہر آجایئے، اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی مدد فرمائی اور صاف جان بچالی، ایسا کس طرح اور کیسے ممکن ہوا یہ محض قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے، مفتی امین الحسینی صاحب مرحوم نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ آپ گاڑی سے اس طرح نکلے جیسے حضرت یونس شکم ماہی سے نکلے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اللہ کو محمد میاں سے کام لینا تھا اور ''البعث الاسلامی'' کے ذریعہ عالم عربی میں ہندوستان کی ایک بے سروسامان جماعت کی نحیف آواز پہنچانی تھی۔

محمد میاں کے ان زلزلہ انگیز اداریوں کا سلسلہ جاری رہا اور صحیح الفکر عرب

www.abulhasanalinadwi.org

نوجوان روز بروز ان کے گرویدہ ہوتے گئے، جس ماحول اور تربیت میں ان کا نشو ونما ہوا تھا، اس کے بالمقابل دنیائے اسلام بالخصوص عالم عربی کی مذہب بیزار اور اسلام گزیر قومی، اشتراکی، بعثی مادی تحریکوں اور دعوتوں اور بہت سے ممالک عربیہ (اور خاص طور پر ان ممالک کی جن کو دعوت اسلامی کا مرکز اور اسلامی دنیا کے لئے نمونہ ہونا چاہئے تھا) مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کردی اور (جیسا کہ میں نے ان کی معرکۃ الآرا کتاب ''الإسلام الممتحن'' کے مقدمہ میں لکھا ہے)۔

''ان کے قلم کو ایک ایسے آبشار میں تبدیل کردیا جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے اور بڑے جوش وشور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے۔''

اس کا نمونہ ان کے مجموعہ مضامین ''الإسلام الممتحن'' اور ''تناقض تحارفيه العيون'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے آخری زندگی کے مضامین میں ایک اہم مضمون وہ تھا جس میں انہوں نے اس تضاد کا نقشہ کھینچا ہے جو اسلامی ممالک میں عمومیت کے ساتھ اور بعض ان عرب ممالک میں (جو اسلام کی نمائندگی، مقامات مقدسہ کی خدمت وحفاظت اور دین صحیح کی دعوت کے دعویدار اور علمبردار ہیں) وہاں کے سربراہوں اور ذمہ داروں کے اقوال وافعال اور اسلام کی تعلیمات اور وہاں کی روزمرہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے اور جس کو دور کئے بغیر نہ اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آسکتی ہے، نہ یہ ممالک خطرہ سے نکل سکتے ہیں، انھوں نے اس مضمون میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا اور خون کے آنسو روئے تھے، یہ مضمون ان کے رسالہ ''البعث'' کے رجب ۱۳۹۹ھ (جولائی ۱۹۷۹ء کے) شمارہ میں ''سوال حائر يحتاج إلى جواب'' کے عنوان سے

www.abulhasanalinadwi.org

شائع ہوا، میں اہتمام سے البعث اور الرائد پڑھتا ہوں لیکن ان دنوں میں بعض تحریری کاموں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایسا مشغول ہوا کہ یہ نمبر نہیں پڑھ سکا، ان کے حادثۂ وفات کے بعد جب مولانا منظور نعمانی صاحب کے منہ سے اس کی تعریف سنی اور انھوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے ٹیلیفون پر ان کو اس جرأتمندانہ اور مؤثر مضمون پر دل کھول کر داد دی اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کا ترجمہ خود کردیں وہ اس کو اپنے رسالہ ''الفرقان'' میں شائع کردیں گے۔(۱)

مرحوم کے انتقال کے بعد جب میں بمبئی سے واپس ہوا تو میں نے وہ مضمون پڑھا اور پڑھ کر مسرت کے ساتھ یہ حسرت ہوئی کہ میں نے یہ مضمون ان کی زندگی میں کیوں نہ پڑھ لیا تھا، اگر میں ان کی زندگی میں یہ مضمون پڑھ لیتا تو ان کا ہاتھ چومتا اور پیشانی کو بوسہ دیتا، اس کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی اور ان کے لئے آزمائش بن جاتی، لیکن اس کے بغیر اس پسندیدگی کا اظہار ممکن نہ تھا جو اس مضمون کے پڑھنے سے ہوتی ہے، افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گزرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور جانبداری پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوش تحریر و زور قلم میں سید قطب شہید سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب نہیں کہیں (ایک عجمی نژاد نوعمر اور ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) ان سے بڑھ جاتے ہوں کہ فوارہ کی

---

(۱) مرحوم کی اچانک وفات نے اس کی مہلت نہ دی، خدا کو منظور تھا کہ یہ کام ان کے ہونہار فرزند سید عبداللہ حسنی ندوی سلمہ کے قلم سے تکمیل پائے، انھوں نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ اس مضمون کو اردو میں منتقل کیا جو الفرقان ماہ شوال ۱۳۹۹ھ میں ''ایک تضاد جس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا اور اس طرح فارسی کا وہ جملہ صادق آیا، ''اگر پدر نہ تو پسر اند تمام کند''۔

www.abulhasanalinadwi.org

روانی اس کے جوشِ دروں کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ "جوشِ دروں" ان کو اپنے آبائے کرام اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے تعلق و عقیدت سے ملا تھا، جس کی نظیر مشرق وسطیٰ میں (مغربی تعلیم و تربیت اور مغربی تہذیب و تمدن کے اثر سے) اگر مفقود نہیں تو قلیل الوجود ضرور ہے،

میں نے اپنے اس مقدمہ میں اس حقیقت نگاری کی معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرا اور صاحب کتاب کا رشتہ ایک طرح سے باپ بیٹے اور استاد شاگرد کا سا ہے، اس کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں اپنی کسی تصنیف کا مقدمہ لکھنے جا رہا ہوں، جس کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کو "اپنے منہ اپنی تعریف" اظہار کمال اور خود پسندی پر محمول نہ کریں اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے، جس کو دین و شریعت اور اخلاق و تہذیب نے کبھی پسند نہیں کیا اور میں خود بھی امکانی حد تک اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

لیکن جب میں نے اپنے اس احساس کا حقیقت پس انہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا اور اس کا تجزیہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں درحقیقت لوگوں کے تبصرہ اور قیل و قال سے ڈر رہا ہوں، اس خوف و احساس نے اس مسئلہ کو غیر شعوری طور پر ایک اخلاقی رنگ دے دیا ہے، میں طبیعت کی اس کمزوری کو ایک اخلاقی کمزوری سمجھ رہا ہوں، میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس جذبہ و احساس کے سامنے سپر ڈال دی اور اس خوف سے ایک قابلِ قدر کتاب کا مقدمہ لکھنے سے باز رہا کہ وہ میرے ایک خورد اور عزیز کی کتاب ہے تو میں ایک خیالی اخلاقی کمزوری اور کوتاہی کا ارتکاب کروں گا، اس لئے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات جہاں اعزہ اور اقارب (اگر وہ برسرِ باطل ہوں) کے خلاف شہادت دینے کو ضروری قرار دیتی ہیں وہیں ان اعزہ و اقارب کے حق میں (اگر وہ برسرِ حق ہوں) شہادت دینے کو بھی واجب گردانتی ہیں، قرآن ... جہاں یہ فرمایا گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

﴿يَـآ أَيُّهَـا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰىٓ اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ﴾ (۱)

''اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار بنے رہو اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو، خواہ گواہی تمھاری اپنی ذات، ماں باپ اور عزیزوں کے خلاف پڑے۔''

وہیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمَانَاتِ إِلٰىٓ اَهۡلِهَا وَاِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمۡ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيۡعًاۢ بَصِيۡرًا﴾ (۲)

''خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو، خدا تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔''

اس نابغۂ جواں سال جس نے اپنی عمر کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، اسلام کے اس پُر جوش داعی وسپاہی اور اس پر مستزاد اپنے گھر کے اس ''گوہرِ شب چراغ'' اور لختِ جگر کے انتقال سے دل و دماغ پر جو گزری اور گزر رہی ہے اس کو امیر خسرو کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جو انہوں نے کسی ایسے ہی حادثہ پر اپنے مالک حقیقی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ حقیقت حال کی عکاسی اور دل کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہوسکتی ؎

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

●●●

---

(۱) النساء/۱۳۵۔ (۲) النساء/۵۸۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب پنجم

میری تعلیم اور مطالعہ

سیدہ خدیجہ حسنی

اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں میں ایک بڑی نعمت مجھ کو یہ عطا کی کہ ایک ذی علم گھرانے میں میری آنکھ کھلی، میرے والد صاحب ایک مشہور طبیب اور بڑے فاضل و عالم تھے ان کو خدا نے اولاد کی تربیت کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، انہوں نے اپنی ساری اولاد کی تعلیم و تربیت کا بخوبی انتظام کیا اور ان کو اردو عربی کی تعلیم دی اور رفتار و گفتار پر ہر وقت نظر رکھی جو غلط بات دیکھتے تو محبت و شفقت کے ساتھ تنبیہ فرما دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی غیوبت میں بھی کوئی بری بات کرتے طبیعت جھجکتی اور برائی سے نفرت پیدا ہو جاتی میری والدہ صاحبہ مرحومہ کو بھی علم دین سے حد درجہ لگاؤ تھا وہ اکثر و بیشتر طریق النجاۃ (ترجمہ مشکوٰۃ شریف) پڑھا کرتیں جب وہ کھانا کھا کر نیلوا کرتیں تو اپنے ہاتھوں میں طریق النجاۃ لے لیتیں اور پڑھتی رہتیں، اسی طرح تسبیح پڑھنے کا بھی اہتمام کرتیں، ہم سب بھائی بہنوں پر کڑی نگاہ رکھتیں اور غلط جگہ بیٹھنے پر، بیکار کاموں کے کرنے سے روکتیں، والدین کے اسی طریق تعلیم و تربیت کے تحت میری پرورش ہوئی اور میری تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

میرا ذرا سی عمر بڑھی اور میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئی تو میرے والد صاحب قبلہ نے میرے لئے ایک استاد کا انتظام کیا وہ مولوی صاحب بڑے دین دار اور صاحب علم تھے، وہ روز تشریف لاتے اور خوب سمجھا سمجھا کر پڑھاتے جن کی تعلیم دل میں گھر کرتی گئی، میں نے کلام پاک انہیں مولوی صاحب سے ختم کیا کلام پاک کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بہشتی زیور اور فارسی پڑھنی شروع کی اردو مین بہشتی زیور سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا، درحقیقت بہشتی زیور میں مسائل کے علاوہ بھی بہت سی گھریلو زندگی میں کام آنے والی اور چٹکلے نیز علاج و معالجہ کی باتیں معلوم ہوئیں جنہوں نے مجھ کو بہت فائدہ پہنچایا، بہشتی زیور کے علاوہ مولانا عبدالحی حسنی صاحب کی ایک مختصر سی کتاب روزمرہ کام آنے والے مسائل پر ہے وہ بھی میں نے پڑھی، انہیں مولانا عبدالحی صاحب کی دوسری کتاب جو بچوں کے لئے لکھی ہے جس میں سوالات و جوابات کے انداز میں ایمان وعقیدہ، اعمال اور سیرت نبوی پر بیان ہے، ان کتابوں کے علاوہ مفتی کفایت اللہ صاحب کی مشہور کتاب تعلیم الاسلام کے تمام حصے بڑے شوق وذوق سے پڑھے اوران سے بہت سے مسائل معلوم ہوئے اور برابر کام آتے رہے۔

ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی مخصوص سورتیں سورہ یٰسین، سورۂ رحمٰن، سورۂ واقعہ، سورۂ فتح، سورۂ تبارک الذی یاد کیں، اس لئے کہ ان سورتوں کی فضیلتیں اوران کے پڑھنے کا ثواب اپنے والدین اور بزرگوں سے برابر سنتی آئی تھی، یہاں تک پہنچی تھی کہ میرے استاد سے پردہ ہوگیا، اور میری عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ اب گھر کے اندر ہی پڑھنے لگی، میرے والد صاحب جن کو خدا نے دینی و دنیوی علوم سے بخوبی نوازا تھا مجھ کو خود پڑھانے لگے اور عربی شروع کرادی، سب سے پہلے حکایات الأطفال پڑھائی اس کے بعد بعض دوسری عربی کتابیں، عام مطالعہ میں میں

www.abulhasanalinadwi.org

نے سیرت عائشہؓ الصالحات، اسوۂ صحابیات اور حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کی حکایات صحابہ رکھی، نیز سیر الصحابیات اور مولانا حالی کی مسدس اور چپ کی داد اور اقبال مرحوم کی شکوہ جواب شکوہ مولانا جعفر علی تھانیسری کی تواریخ عجیب اور عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی سیرت احمد شہیدؒ بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھی ان ساری کتابوں کے پڑھنے کے بعد مطالعہ کا شوق بڑھتا رہا اور اب بھی دینی کتابوں کے مطالعہ سے بڑی دلچسپی ہے اور مشغول اوقات میں کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ کے لئے موقعہ نکال لینا آسان معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان سارے مصنفین کو جزائے خیر دے جنہوں نے کتابیں لکھیں اور ان سے مجھ کو فائدہ پہنچا، خاص طور سے میرے والدین کو جو اب اس دنیا میں نہیں ہے، اپنی بے پایاں رحمت و مغفرت سے نوازے کہ انہیں دونوں کی تعلیم و تربیت دیکھ بھال اور توجہ سے مجھ کو دینی کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، اور فائدہ پہنچا۔

آخر میں تمام بہنوں سے عرض کرتی ہوں کہ وہ اس عنوان کے تحت برابر رضوان میں اپنے مضمون لکھیں کہ کن کن کتابوں سے ان کو دین کا ذوق پیدا ہوتا تا کہ ہر پڑھنے والی بہن کو ان کتابوں کا علم ہو اور ان کو مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔ (۱)

●●●

(۱) ماہنامہ رضوان، جولائی، اگست ۶۷ء۔

www.abulhasanalinadwi.org